الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

دو آدمی آپس میں جھگڑیں تو دونوں غلطی پر ہیں
اگر کوئی ایک صحیح ہوتا تو وہ جھگڑے کی جگہ سے ہٹ جاتا
اور پھر جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جاتا ——

قیمت فی پرچہ —— تین روپے

الرسالہ

فروری ۱۹۸۲
شمارہ ۶۳

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دھلی ۶ (انڈیا)

ایک پکار

اسلام کے صحیح اور مؤثر تعارف کی مہم جو ادارۂ الرسالہ نے شروع کی تھی وہ خدا کے فضل سے اس نوبت تک پہنچ گئی ہے کہ اب ہمارے پاس اسلامی کتابوں کا مکمل سیٹ تیار ہو گیا ہے۔ تاہم اس کام کو مزید آگے بڑھانے کے لئے سرمایہ کی شدید ضرورت ہے۔ کئی اردو کتابیں تیار ہو کر طباعت کے لئے رکی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ اب انگریزی، عربی اور ہندی وغیرہ میں اشاعتی سلسلہ شروع کرنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔

اس سلسلے میں جو لوگ اعانت یا قرض کے طور پر سرمایہ فراہم کریں وہ اللہ کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔ اس سلسلے میں جو لوگ تعاون کر سکتے ہوں وہ ہم کو مطلع فرمائیں۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خدا اور انسان

کائنات خدا کا آئینہ ہے۔ یہاں خدا اپنی مخلوقات کے روپ میں نمایاں ہے۔ آدمی کی حساسیت اگر زندہ ہو تو اپنے گرد و پیش وہ خدا کو پائے گا۔ اپنے چاروں طرف وہ خدا کا مشاہدہ کرے گا۔ خدا کی کائنات اس کے لئے خدا کا زندہ ثبوت بن جائے گی۔

دنیا میں زندگی کی سرگرمیاں اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایک زندہ ہستی ہے نہ کہ کوئی ایسی ہستی جو زندگی اور حیات سے محروم ہو۔ جب سورج نکلتا ہے اور چھپی ہوئی چیزیں اس کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں، جیسے خدا ایک دیکھنے والی ہستی ہو اور اپنی آنکھوں سے سارے عالم کو دیکھ رہا ہو۔ دریاؤں میں جب پانی کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو وہ پُرشور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جنگل کا شیر جب اپنا پنجہ نکال کر کسی جانور کو اپنی پکڑ میں لیتا ہے تو گویا وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خدا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلا کی بے پایاں وسعتیں اس حقیقت کا ابدی اظہار ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک لامحدود ہستی ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اتھاہ ہے اور اپنی صفات میں بھی۔

خدا کا یہ کائناتی مشاہدہ ایک طرف آدمی کے اندر خدا کا یقین پیدا کرتا ہے دوسری طرف اس کو بہت بڑے سوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دنیا کا اگر خدا ہے تو وہ اپنی دنیا میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے پناہ برائیاں ہیں۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ ایک شخص موقع پا کر دوسرے شخص کو ذبح کر دیتا ہے۔ یہ سب خدا کی دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ مظلوموں کی جانب کھڑا نہیں ہوتا۔

اس سوال کو صرف اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ مخلوقات کے بارہ میں خالق کی اسکیم کو سمجھ لیا جائے۔ موجودہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں، وہ صرف امتحانی بندوبست ہے۔ یہ گویا ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکاڑ۔ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے بہترین مواقع دے کر تمام برے درختوں کو اکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدا کی دنیا خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن اور لذت کی ابدی بہشت بن جائے گی۔

بے قیمت الفاظ

الرسالہ کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں نکلا۔ اس سے پہلے ہمارے بہت سے دوست ہم سے کہتے تھے کہ آپ اپنا علیحدہ پرچہ نکالئے، ہم اس میں آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ پیسہ دیں گے۔ خریدار بنوائیں گے۔ اشتہار دلائیں گے۔ انتظامی خدمات انجام دیں گے۔ مگر عملاً جو صورت پیش آئی وہ صرف دو تھی:

۱۔ بیشتر لوگ وہ تھے جنھوں نے سرے سے کسی قسم کا کوئی تعاون نہیں دیا۔ الرسالہ نکالنے سے پہلے وہ بڑے بڑے الفاظ بولے تھے، انھوں نے ہم سے خوبصورت وعدے کئے تھے۔ مگر جب عمل کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے الفاظ پر عمل نہیں کیا۔ وہ صرف بولنے والے ثابت ہوئے، وہ کرنے والے ثابت نہ ہو سکے۔

۲۔ دوسرے لوگ، نسبتاً کم، وہ تھے جنھوں نے الرسالہ کے ساتھ کچھ تعاون کیا۔ مگر ان کا تعاون بہت جلد ختم ہو گیا۔ ان کا حال یہ ہوا کہ ذرا سی کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوئی یا کسی نے ہمارے خلاف کوئی شوشہ ان کے کان میں ڈال دیا تو وہ بدک کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی بھی دلیل انھیں مطمئن کرنے والی ثابت نہ ہو سکی۔

الرسالہ کا یہ چھ سالہ تجربہ موجودہ سماج کا آئینہ ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ہر آدمی خوبصورت الفاظ کا ایک کارخانہ بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی شان دار باتیں کرتا ہے، بڑے بڑے وعدے کر لیتا ہے۔ مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو اپنے وعدوں اور اپنے الفاظ کو وہ اس طرح بھول جاتا ہے جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ تھا۔ اگر اس کو اس کی وعدہ خلافی یاد دلائیے، اس کے قول و عمل کے فرق کو اس پر واضح کیجئے تو اب اس کے پاس نئے الفاظ کا وسیع تر ذخیرہ موجود ہوگا جو اس کی اپنی ذات کو بالکل صحیح ثابت کر رہے ہوں اور آپ کو بالکل غلط۔

اس قسم کے الفاظ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ ایسے بولے ہوئے الفاظ جن پر عمل کے وقت عمل نہ کیا جائے گویا بے کار چیک (Dud Cheque) ہیں جو صرف کاغذ پر لکھ کر دے دئے جائیں مگر آدمی کے کھاتہ میں ان کی ادائگی کے لئے ضروری رقم موجود نہ ہو۔ یہاں ہم موطا امام مالک کی ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

امام مالک نے کہا، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد کہتے تھے کہ میں نے ایسے لوگ (اصحاب رسول) دیکھے ہیں جو قول پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ امام مالک نے کہا، اس سے ان کی مراد عمل تھی۔ آدمی کا صرف عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا (انما ینظر الی عملہ ولا ینظر الی قولہ)

شبہات

۱۹۵۰ کے لگ بھگ کی بات ہے۔ میں اعظم گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ خرید رہا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور چھوٹنے کے قریب تھی کہ ایک دیہاتی آدمی ٹکٹ لینے کے لئے آگیا۔ اس کو جس مقام تک جانا تھا اس کا کرایہ چند روپیہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کھڑکی کے اندر ڈال کر کھولی تو اس میں سب چھوٹی ریزگاری تھی۔ بابو اس کو دیکھ کر بگڑ گیا اور بولا: روپیہ لے آؤ، اتنی سب ریزگاری ہم کب تک گنتے رہیں گے۔ مجھے غریب دیہاتی پر رحم آیا۔ میں نے فوراً جیب سے نوٹ نکالے اور اس سے کہا کہ تم یہ نوٹ لے لو اور ریزگاری مجھے دے دو۔ مگر دیہاتی نے میری پیش کش قبول نہ کی۔ اس نے وحشت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک طرف چلا گیا۔ میں تیزی سے چل کر ٹرین پر سوار ہو گیا۔ تاہم میری نظریں اس دیہاتی کا ناکام تعاقب کرتی رہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ دیہاتی وقت پر ٹکٹ نہ لے سکا اور وہ ٹرین اسے چھوڑ دینی پڑی۔

دیہاتی آدمی نے میری پیش کش کیوں قبول نہ کی۔ اس کی وجہ "شبہ" ہے۔ اس نے سمجھا کہ میں اس کی کم زوری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اپنے خراب سکوں کو اس کی ریزگاری سے بدل لینا چاہتا ہوں۔ یہ شبہ اس کے ذہن پر اتنا چھایا کہ وہ اپنی ریزگاری کو میرے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا یہاں تک کہ اس کی گاڑی اس سے چھوٹ گئی۔

یہی آج ہمارے سماج کی عام حالت ہے، ہر آدمی دوسرے آدمی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو بے بھروسہ سمجھ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے پورے سماج میں ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو بہت سے ممکن فائدوں سے محروم کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اکثر کام کرنے کے لئے کئی آدمیوں کا تعاون ضروری ہوتا ہے اور شبہات کی فضا نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا امکان ہی ختم کر دیا ہے۔

شبہ سے شبہ جنم لیتا ہے اور اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگیں تو جواب میں اس کے اندر بھی آپ کے خلاف شبہات پیدا ہوں گے اور دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کے ساتھ اعتماد کا معاملہ کریں تو اس کے دل میں بھی آپ کے بارے میں اعتماد پیدا ہوگا اور دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔

جو "انسان" ایک جسم کے اندر ہے وہی انسان دوسرے جسم کے اندر بھی ہے۔ مگر آدمی اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ خود کچھ اور ہے اور دوسرا کچھ اور۔

اندھیرا ختم ہوگا

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک تضاد ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے اور کل وہ اس سے پھر جاتا ہے۔ جس دنیا میں سخت پتھروں کے اندر سے بھی پانی نکل پڑتا ہے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ بدترین بے دردی کا ثبوت دیتا ہے۔ جس دنیا میں اس کا چاند تمام مخلوقات کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے وہاں انسان ایک کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے اور دوسرے ساتھ کچھ۔ جس دنیا کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے وہاں انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادم کی طرح پھر رہے ہیں وہاں انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ جس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کرکے خوشی کے قہقہے لگاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا، وہ اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ مخلوقات کے آفاقی آئینہ میں خدا کتنا حسین معلوم ہوتا ہے مگر انسانی زندگی کے المناک گوشہ میں اس کا چہرہ کتنا مختلف ہے۔ خدا کے سامنے درندگی کے واقعات آتے ہیں مگر اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے سب سے زیادہ حساس باسیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے خلاف اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں ابھرتی۔ کیا خدا پتھر کی مورتی ہے، کیا وہ ایک انتہائی کامیاب اسٹیچو ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے مگر اس کے بارہ میں اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔

اس سوال نے ہر زمانہ کے سوچنے والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ مگر یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ خالق کی اسکیم میں دنیا دارالامتحان ہے مگر ہم اس کو دارالجزا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کل کے دن پیش آنے والا ہے اس کو ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جس طرح ہر روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیرا ختم ہو۔ ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں۔ سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔ یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہوگا، مگر وہ موت کے بعد ہوگا نہ کہ موت سے پہلے۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمھارے اوپر زیادتی کرے اور تم صبر نہ کرسکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کرسکتے ہو جتنا اس نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کردو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا (فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ، الشوری ۴۰)

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پاکر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اور اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرلے تو اس کا یہ عمل کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پاکر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بینک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جاسکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائگی سے انکار کردیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لئے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا۔ جو چیک انسانی بینک میں کیش نہ ہوسکا وہ خدائی بینک میں کیش ہوگا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

خدا سے ڈرو

آج کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہ کر رہا ہو۔ آج مسلمان اپنے بھائی کو ستانے کے لئے سب سے زیادہ شیر بنا ہوا ہے۔ مگر لوگ کس آدمی کو ستاتے ہیں۔ اس آدمی کو جو ان کی نظر میں کمزور ہو۔ جو دادا گیری کرنا نہ جانتا ہو، جس نے اپنے آگے پیچھے ساتھیوں کی فوج نہ جمع کر رکھی ہو، جو پولس اور کچہری سے دور رہنا چاہتا ہو۔ لوگ بے زوروں کے لئے بہادر ہیں اور جو شخص لوگوں کو زور آور دکھائی دیتا ہو اس کے لئے کوئی بہادر نہیں۔

مگر یہ اندھے پن کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اگر ان کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہو تو وہ سب سے زیادہ اس سے ڈریں جس کو وہ بے زور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص بے زور ہے اس کے پیچھے خدا کھڑا ہوا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آزمائش کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ خدا کو جانچ کر ہر شخص کے بارے میں جاننا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے اور وہ کون ہے جو اللہ سے بے خوف ہے۔ اس کی جانچ کیسے ہو۔ اس کی جانچ ان اشخاص کی سطح پر نہیں ہو سکتی جو اپنی زور آوری کی وجہ سے لوگوں کو مرعوب کئے رہتے ہیں، جن کی طاقت دیکھ کر لوگوں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف اگر لوگ برائی نہ کریں تو یہ ان کی اپنی طاقت سے ڈرنے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ خدا کے ڈر کی وجہ سے۔

مگر ایک شخص ہے جس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرتی ہے۔ اس کو ستانے سے اگر کوئی شخص بچتا ہے تو اس کی وجہ یقیناً اخلاقی ہوگی نہ کہ مادی۔ خدا کچھ افراد کو بے زور اور بے حیثیت بنا کر لوگوں کے درمیان رکھتا ہے اور پھر ان کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرا وہ گویا خدا سے ڈرا، اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے نہیں ڈرا وہ گویا خدا سے نہیں ڈرا، ایسا شخص جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

ہر آدمی بری زندگی گزار کر مرجاتا ہے تاکہ موت کے بعد اور زیادہ بری زندگی کی طرف دھکیل دیا جائے!

یہ سونے والے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کہ جہنم جیسی چیز سے بھاگنے والا سو گیا ہو اور میں نے نہیں دیکھا کہ جنت جیسی چیز کو چاہنے والا سو گیا ہو (مارأیت مثل النار نام هاربها ومارأیت مثل الجنة نام طالبها)

جہنم کا عذاب کتنا ہولناک ہے۔ مگر آدمی اس سے غافل ہے۔ جنت کی نعمتیں کتنی لذیذ ہیں مگر آدمی کو اس کا کوئی شوق نہیں۔ یقیناً یہ زمین پر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔

لوگ سو رہے ہیں تاکہ اس وقت جاگیں جب کہ جہنمی آگ کے شعلے ان کے لئے سونے کو ناممکن بنا دیں۔

لوگ غافل ہیں تاکہ اس وقت ہوشیار ہوں جب کہ محرومی اور رسوائی ان کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کے لئے اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز بتا رہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ با اختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشوں میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جا رہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لئے نااہل ثابت کر رہا ہے۔

آہ وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق ہونا چاہئے۔ آہ وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اس کو سب سے زیادہ خوف کرنا چاہئے۔

کتنا فرق

۱۹۲۸ میں کلکتہ میں ایک ہی زمانہ میں دو اجلاس ہوئے۔ ایک کانگریس کا، دوسرا تحریک خلافت کا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر تھے اور مولانا محمد علی تحریک خلافت کے۔ خان عبدالغفار خاں اپنے کچھ پٹھان ساتھیوں کو لے کر کلکتہ گئے اور دونوں کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ خان عبدالغفار خاں اپنا ایک تاثر اپنی خودنوشت سوانح عمری میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"گاندھی جی (کانگرس کے اجلاس میں) تقریر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان بار بار کھڑا ہو جاتا تھا اور گاندھی جی پر سخت حملے کرتا تھا۔ گاندھی جی بالکل غصہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ منھ کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس پڑتے تھے۔ اس کا میرے اوپر بڑا اثر ہوا۔ جب میں واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگذشت اپنے ساتھیوں کو سنائی اور کہا کہ دیکھو یہ ہندوؤں کا لیڈر ہے۔ اس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنے مسلمان لیڈروں کے اخلاق کو دیکھو۔

اس وقت ہم کچھ پٹھان لوگ (خلافت کانفرنس میں) محمد علی کے پاس گئے کہ یہ ہمارا لیڈر ہے، اس کے ساتھ اس بارہ میں چند باتیں کریں۔ محمد علی باہر آئے تو ہم نے ان سے اس طریقہ سے اپنی بات کہنی شروع کی کہ محمد علی صاحب، آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ کل ہم کانگرس کے اجلاس میں گئے تھے تو وہاں گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بعض نوجوان اُن کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی وجہ سے ان کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندی پیدا نہیں ہوئی۔ پھر میں نے کہا کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادہ پیدا کر لیں تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔

محمد علی صاحب ہماری باتیں سنتے ہی بڑے ناراض اور غضب آلود ہوئے اور کہا کہ دیکھو، یہ جنگلی پٹھان ہمیں سمجھانے آئے ہیں اور پھر ہم کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم ان کے اس رویہ سے بڑے مایوس ہوئے اور ناراض بھی۔ اور میں تو پھر اس کے بعد خلافت کے ان جلسوں میں بالکل شریک نہیں ہوا اور چلا آیا۔ واپس اپنے گاؤں جاکر میں نے اپنے پختون ساتھیوں سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ کلکتہ میں میں خلافت اور کانگرس دونوں کے جلسوں میں شریک ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہمارے مسلمان لیڈروں اور ہندوؤں کے لیڈروں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایک طرف غصہ کے جذبات بھڑکتے دکھائی دے اور دوسری طرف محبت اور پریم سے باتیں کی جاتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی واقعی ہندوؤں کے ہی لیڈر نہیں رہیں گے بلکہ وہ مسلمانوں کی لیڈری بھی کریں گے۔ ان کا مزاج گرم نہیں۔ بلکہ ان کے جذبات ٹھنڈے ہیں۔ وہ گالیاں کھاکر بھی ہنس دیتے ہیں۔

عہدہ نہ ملنے پر

امام شافعی ۱۹۸ھ میں مصر آئے اور وہاں چار سال قیام کیا۔ اس زمانہ میں جو لوگ ان کے شاگرد ہوئے ان میں یوسف بن یحییٰ بویطی اور ابن عبدالحکم بھی تھے۔ امام شافعی کے انتقال کے بعد یہ سوال ہوا کہ مصر میں ان کے حلقہ درس کا مسند نشین اور ان کا قائم مقام کون ہو۔ امام شافعی اپنے تمام شاگردوں میں یوسف بن یحییٰ بویطی کو زیادہ مانتے تھے۔ بلکہ ان کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد بھی کر چکے تھے۔ تاہم امام شافعی کے انتقال کے بعد جب یوسف بن یحییٰ بویطی نے امام شافعی کی مسند پر بیٹھنا چاہا تو ابن عبدالحکم نے دعویٰ کر دیا کہ اس مسند کا زیادہ حق دار میں ہوں۔

اس وقت مصر میں امام شافعی کے مکی شاگرد امام حُمیدی موجود تھے۔ انھوں نے بویطی کے حق میں فیصلہ دیا۔ امام حمیدی نے کہا: امام شافعی نے مجھ سے کہا تھا کہ میری مجلس کا حق دار بویطی سے زیادہ کوئی نہیں اور نہ میرے ساتھیوں میں بویطی سے زیادہ کوئی صاحب علم ہے۔ ابن عبدالحکم نے یہ سن کر امام حمیدی سے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ امام حمیدی نے جواب دیا: جھوٹ بات تم نے کہی، تمھارے باپ نے کہی، تمھاری ماں نے کہی (کذبت انت وابوك وامك)

ابن عبدالحکم اس بات پر سخت ناراض ہوئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے باپ کے مسلک کے مطابق مالکی مسلک رکھتے تھے۔ پھر شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اس واقعہ کا اثر ان کے اوپر اتنا زیادہ ہوا کہ انھوں نے شافعی مسلک چھوڑ دیا اور دوبارہ مالکی مسلک اختیار کر لیا (طبقات الشافعیۃ الکبری)

ابن عبدالحکم یہ چاہتے تھے کہ شافعی مسلک کی مسند درس پر بیٹھیں۔ مگر جب ان کو درس کی مسند نہ ملی تو انھوں نے خود اپنے لئے بھی اس مسلک کو پسند نہ کیا جس کے لئے وہ دوسروں کے سامنے نمائندہ بننے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہی اکثر لوگوں کا حال ہے۔ وہ اسلام یا کسی ادارہ کے حامی بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر حقیقۃً ان کی ساری دل چسپی اس اسلام یا اس اسلامی ادارہ سے ہوتی ہے جو انھیں ایک شان دار اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع دے، جو ان کے لئے عوام کے درمیان ایک امتیازی سند فراہم کر رہا ہو۔ اگر شاندار اسٹیج نہ ملے تو ایسے اسلام کی خدمت کرنے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ ایک شخص صدارت کی کرسی سے یہ تقریر کرتا ہوا سنائی دے گا کہ اس عظیم مقصد کے لئے چپراسی کی حیثیت سے خدمت کرنا بھی میں اپنے لئے فخر سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر وہ اپنے کو صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہوا نہ پائے تو اس وقت اس مقصد کے میدان میں اس کے لئے کرنے کا کوئی کام نہ ہوگا۔ اسلام کی صدارت کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے مگر اسلام کی خدمت کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

اسلام کا فیضان

محمد اسد صاحب (سابق نام لیوپولڈ) پولینڈ میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اپنے قبول اسلام کی داستان انھوں نے بہت دلچسپ انداز میں اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے جس کا نام ہے "روڈ ٹو مکہ"۔ وہ اپنا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

۱۹۲۴ میں میں ایک عربی اخبار کے نمائندہ کی حیثیت سے شرق اوسط کے دورہ پر روانہ ہوا۔ میں مصری علاقہ میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میرے ڈبہ میں میرے علاوہ دو مسافر اور تھے۔ ایک اسکندریہ کا یونانی تاجر، دوسرا ایک مصری کاشتکار۔ گفتگو کے دوران یونانی تاجر نے کہا: اسلامی شریعت عادلانہ شریعت نہیں۔ مسلمان اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ اسلام جب مسلمان مردوں کو عیسائی اور یہودی عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے تو وہ مسلمان عورتوں کو اس کی اجازت کیوں نہیں دیتا کہ وہ بھی عیسائی اور یہودی مردوں سے نکاح کر سکیں۔ کیا ایسے قانون کو انصاف کا قانون کہا جا سکتا ہے۔

مصری کاشت کار فوراً بولا: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسلامی شریعت نے ایسا قانون کیوں بنایا ہے، ہم مسلمان حضرت مسیح کو حضرت ابراہیم اور دوسرے رسولوں کی طرح خدا کا رسول مانتے ہیں۔ ان کی اسی طرح عزت کرتے ہیں جس طرح تمام رسولوں کی کرتے ہیں، اگر کوئی یہودی یا عیسائی لڑکی ایک مسلمان سے نکاح کرتی ہے تو اس کو اس بات کا اطمینان رہتا ہے کہ اس کے نئے گھر میں اس کے مقدس بزرگوں کا نام عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان لڑکی کسی یہودی یا عیسائی مرد سے شادی کرے تو اس کو بجا طور پر اس کا اندیشہ رہے گا کہ جس ہستی کو وہ خدا کا رسول مانتی ہے، ممکن ہے اس کو اس کی سسرال میں برے ناموں سے یاد کیا جائے۔ ایسی صورت میں کیا آپ اس کو انصاف کہیں گے کہ ایک عورت کو مستقل طور پر ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں وہ مسلسل اہانت اور اذیت برداشت کرنے پر مجبور ہو۔

یہ مصری مسلمان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ایک تعلیم یافتہ شخص کے سوال کا ایسا جواب دیا جس کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ زندگی کے تمام تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس میں اور دوسری حقیقتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ جب کوئی شخص اسلام کو پاتا ہے تو گویا وہ تمام حقائق کا سرا پا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ذہن ہر سوال کا ایسا جواب پا لیتا ہے جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ اس کو ایسا نظریہ مل جاتا ہے جس پر وہ کسی تضاد کے بغیر عمل کر سکے۔

جواہرات اس کی بھوک نہ مٹا سکے

مستعصم باللہ عباسی دور کا آخری خلیفہ تھا جس نے بغداد میں حکومت کی۔ تاتاریوں کے سردار ہلاکو خاں کے ہاتھوں وہ ۶۵۶ھ میں ذلیل طریقہ سے مارا گیا۔ یہی وہ خلیفہ ہے جس کے زمانہ میں تاتاریوں نے مسلم سلطنت کو برباد کیا۔ انھوں نے اتنے مسلمان قتل کئے کہ دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان شاہی کتب خانہ کی کتابیں جمع کیں اور دجلہ میں ڈال دیں تو کہا جاتا ہے کہ دجلہ کا پانی ان کتابوں کی سیاہی سے کالا ہوگیا اور عرصہ تک کالا رہا۔

معتصم باللہ کے پاس زر و جواہر کا زبردست خزانہ تھا مگر اس کو اس نے تہ خانوں میں بند کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے شیعہ وزیر علقمی کے مشورہ پر اپنے فوجیوں کی تنخواہیں روک دیں "تاکہ ملکی محاصل میں کمی کو پورا کیا جاسکے" اس کے بعد اس نے فوج کی بہت بڑی تعداد کی چھٹی کر دی۔ عربوں کی بہادری اور فوج کی کثرت کی وجہ سے تاتاریوں کو بغداد کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مگر علقمی، جو عباسی اقتدار کو ختم کر کے علوی اقتدار لانے کی خاطر تاتاریوں سے مل گیا تھا، اس نے جب ہلاکو خاں کو فوج کی کمی کی خفیہ خبر دی تو اس کی ہمت ہوگئی اس نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کے بعد اتنے ظالمانہ طریقہ پر اس کو ختم کیا کہ اس کی کوئی دوسری مثال شاید انسانی تاریخ میں نہیں ملے گی

بغداد کی تباہی کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ جیل خانہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کو کھانا پانی بھی نہیں پہنچتا تھا۔ ایک روز بھوک پیاس سے بیتاب ہوکر خلیفہ نے ہلاکو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس کے لئے کھانے پینے کا انتظام کر دے۔ ہلاکو نے حکم دیا کہ خلیفہ کے محل سے جو بے شمار زر و جواہر حاصل ہوئے ہیں ان کا ایک طشت خلیفہ کے پاس لے جاؤ۔ خلیفہ نے جب زر و جواہر سے بھرا ہوا طشت دیکھا تو اس نے کہا: مجھے کھانے کی ضرورت ہے اور جواہرات کھائے نہیں جاسکتے (ان الجواھر لا تؤکل) ہلاکو نے جواب دیا: جب زر و جواہر تمھاری بھوک نہیں مٹا سکتے تو تم نے کیوں نہ ایسا کیا کہ یہ جواہرات تم اپنی فوج کو دیتے اور ان کے ذریعہ اپنے ملک کے دفاع کا انتظام کرتے۔ اس کے بعد ہلاکو خاں نے حکم دیا کہ اس کو اسی بھوک پیاس کی حالت میں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ذلت کے ساتھ مار ڈالا گیا۔

تاریخ میں اس طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو انسان کو سبق دے رہے ہیں کہ وہ حرص اور حق تلفی کا طریقہ چھوڑ دے اور قناعت اور انصاف پسندی کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے ان واقعات سے اپنے لئے کوئی سبق سیکھا ہو۔

اعتراف

ایک نوجوان کھلاڑی کو ایک فٹ بال ٹیم میں شامل ہوکر میچ کھیلنا پڑا۔ اتفاق سے اس کی ٹیم ہارگئی۔ ہارنے کے بعد نوجوان نے اپنے باپ کو خط لکھا :

ہمارے مخالفوں کو ہماری دفاعی لائن میں ایک زبردست شگاف مل گیا تھا۔
اور وہ شگاف میں ہی تھا۔

یہ اعتراف کسی آدمی کے لئے سب سے بڑی بہادری ہے اور یہی تمام اجتماعی ترقیوں کی جان بھی ہے۔ ہر شکست " دفاعی لائن میں کسی شگاف " ہی کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ اور اس کا بہترین علاج اس کا اعتراف ہے۔ اعتراف کے ذریعہ اصل مسئلہ بغیر کسی مزید خرابی کے حل ہوجاتا ہے۔ اعتراف کرنے والا یا تو اپنی کمی کا احساس کرتے ہوئے اپنے آپ کو میدان سے ہٹا دیتا ہے۔ اور اس طرح دوسرے بہتر لوگوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ یا وہ اپنی ہار کو وقتی معاملہ سمجھ کر مزید تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر کامیاب ہوجاتا ہے۔

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اعتراف ہے۔ ایمان ایک اعتراف ہے۔ کیونکہ ایمان لاکر آدمی اپنے مقابلہ میں خدا کی بڑائی کا اقرار کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق کی ادائگی اعتراف ہے۔ کیونکہ ان پر عمل کرکے ایک شخص بین انسانی ذمہ داریوں کا اقرار کرتا ہے۔ توبہ ایک اعتراف ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے آدمی اس حقیقت کا اقرار کرتا ہے کہ صحیح وہ ہے جو خدا کے نزدیک صحیح ہے اور غلط وہ ہے جو خدا کے نزدیک غلط ہے۔ زندگی کی ہر قسم کی اصلاح کا راز اعتراف میں چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ انسان ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ اگر وہ اعتراف نہ کرے تو اس کی غلطیوں کی اصلاح کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

اعتراف تمام ترقیوں کا دروازہ ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اعتراف کے لئے آمادہ کرسکے۔ جب بھی ایسا کوئی موقع آتا ہے تو آدمی اس کو اپنی عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ وہ اپنی غلطی ماننے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خرابی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے کہ جس غلطی کا صرف زبانی اقرار کرلینے سے کام بن رہا تھا اس غلطی کا اسے اپنی بربادی کی قیمت پر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

شوق کافی ہے

استاد یوسف دہلوی (م ۱۹۷۰) مشہور خوشنویس تھے۔ ان کو فن خطاطی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار جلی خط کا مقابلہ ہوا۔ جینا کے کنارے ریت کے میدان میں بہت سے خطاط جمع ہوئے۔ استاد یوسف آئے تو ان کے ہاتھ میں بانس کا ایک بڑا ٹکڑا تھا۔ انھوں نے بانس سے ریت کے اوپر لکھنا شروع کیا۔ الف سے ش تک پہنچے تھے کہ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ بس کیجئے۔ استاد یوسف نے کہا: میں نے جو لکھا ہے اس میں رنگ بھر دو اور پھر ہوائی جہاز سے چھوٹے سائز میں ان کا فوٹو لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ فوٹو میں وہی خط رہے گا جو میرا اصل خط ہے۔ اس کے بعد کسی اور کو اپنا فن پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں شاہ سعود کی آمد پر ان کو ایک محراب کا مضمون لکھنے کے لئے دیا گیا۔ استقبال کی تیاریوں کا بچشم خود معائنہ کرنے کے لئے گورنر جنرل آئے۔ اس دوران انھوں نے استاد یوسف کا لکھا ہوا محراب بھی دیکھا۔ اس کے شان خط کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کس خطاط نے لکھا ہے۔ چنانچہ استاد یوسف کو بلایا گیا۔ گورنر جنرل نے ان کے کام کی تعریف کی اور پوچھا کہ اس کو لکھنے میں آپ کا کتنا وقت لگا۔ استاد یوسف نے کہا کہ سات دن۔ گورنر جنرل نے فوراً اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ استاد کو ان کی خدمت کے اعتراف میں سات ہزار روپے پیش کرو۔ چنانچہ اسی وقت ان کو اتنی رقم کا چیک دے دیا گیا۔

استاد یوسف سے ایک شخص نے پوچھا کہ خوش نویسی کا فن آپ نے کس استاد سے سیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی سے نہیں۔ ان کے والد خود ایک مشہور خوش نویس تھے۔ مگر انھوں نے اپنے والد کی شاگردی بھی نہیں کی۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں نے خوش نویسی کا فن لال قلعہ سے سیکھا ہے۔ لال قلعہ میں مغل دور کے استادوں کی وصلیاں (تختیاں) رکھی ہوئی ہیں۔ ان تختیوں میں قطعات لکھے ہوئے ہے جو فن خطاطی کے شاہکار نمونے ہیں۔ استاد یوسف دس سال تک برابر یہ کرتے رہے کہ لال قلعہ جاکر ان تختیوں کو دیکھتے۔ ہر روز ایک قطعہ اپنے ذہن میں بٹھا کر واپس آتے۔ اس کو اپنے قلم سے بار بار لکھتے۔ اور پھر اگلے دن اپنا لکھا ہوا کاغذ لے کر لال قلعہ جاتے۔ وہاں کی محفوظ تختی سے اپنے لکھے ہوئے کو ملاتے اور اس طرح مقابلہ کر کے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ اس طرح مسلسل دس سال تک ہر روز لال قلعہ کی قطعات کی تختیوں سے وہ خود اپنی اصلاح لیتے رہے اور ان کو دیکھ دیکھ کر مشق کرتے رہے۔ یہی دس سالہ جد وجہد تھی جس نے انھیں استاد یوسف بنا دیا۔

اگر آدمی کے اندر شوق ہو تو نہ پیسہ کی ضرورت ہے اور نہ استاد کی، نہ کسی اور چیز کی۔ اس کا شوق ہی اس کے لئے ہر چیز کا بدل بن جائے گا۔ وہ بغیر کسی چیز کے سب چیز حاصل کرلے گا۔

افسوس نہ کیجئے

امریکہ کے ایک نفسیاتی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جس چیز میں اپنا وقت برباد کرتا ہے وہ افسوس ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بیشتر لوگ ماضی کی تلخ یادوں میں گھرے رہتے ہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھتے رہتے ہیں کہ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو میرا جو کام بگڑ گیا وہ نہ بگڑتا۔ اگر میں نے یہ تدبیر کی ہوتی تو میں نقصان سے بچ جاتا۔ وغیرہ

اس قسم کے احساسات میں جینا اپنے وقت اور قوتوں کو ضائع کرنا ہے۔ گزرا ہوا موقع دوبارہ واپس نہیں آتا، پھر اس کا افسوس کیوں کیا جائے۔ مذکورہ ڈاکٹر کے الفاظ میں بہترین بات یہ ہے کہ ہر ایسے موقع پر آپ یہ کہیں کہ اگلی بار میں اس کام کو دوسرے ڈھنگ سے کروں گا:

Next time I'll do it differently

جب آپ ایسا کریں گے تو آپ گزرے ہوئے معاملہ کو بھول جائیں گے۔ آپ کی توجہ جو اس سے پہلے ماضی کی بے فائدہ یاد میں لگی ہوئی تھی، وہ مستقبل کے متعلق غور و فکر اور منصوبہ بندی میں لگ جائے گی (ریڈرز ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۸۱)

اس کا نقد فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ آپ افسوس اور کڑھن میں اپنی قوتیں ضائع کرنے سے بچ جائیں گے۔ جو چیز اس سے پہلے آپ کے لئے صرف تلخ یاد بنی ہوئی تھی، وہ آپ کے لئے ایک قیمتی تجربہ کی حیثیت اختیار کرلے گی، ایک ایسا تجربہ جس میں مستقبل کے لئے سبق ہے، جس میں آئندہ کے لئے نئی روشنی ہے۔

افسوس یا غم بیشتر حالات میں یا ماضی کے لئے ہوتے ہیں یا مستقبل کے لئے۔ آدمی یا تو کسی گزرے ہوئے نقصان کا افسوس کرتا رہتا ہے یا ایسے واقعہ کا غم جس کے متعلق اسے اندیشہ ہو کہ وہ آئندہ پیش آئے گا۔ مگر یہ دونوں ہی غیر ضروری ہیں۔ جو نقصان ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔ پھر اس کا غم کرنے سے کیا فائدہ۔ اور جس واقعہ کا اندیشہ ہے وہ بہر حال ایک امکانی چیز ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جس خطرہ کا اندیشہ کرے وہ عین اس کے اندیشہ کے مطابق پیش آجائے۔

نفرت کی تیزاب

مغرب کے ایک ماہر نفسیات کا قول ہے کہ نفرت کی مثال ایک قسم کے تیزاب کی سی ہے۔ ایک عام برتن میں اس کو رکھا جائے تو وہ اپنے برتن کو اس سے زیادہ نقصان پہنچائے گا جتنا اس کو جس پر وہ تیزاب ڈالا جانے والا ہے۔

Hatred is like an acid. It can do more damage to the container in which it is stored than to the object on which it is poured

اگر آپ کو کسی کے خلاف بغض اور نفرت ہو جائے اور آپ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں تو جہاں تک آپ کا تعلق ہے، آپ کے سینے میں تو رات دن ہر وقت نفرت کی آگ بھڑکتی رہے گی۔ مگر دوسرے شخص پر اس کا اثر صرف اس وقت پہنچتا ہے جب کہ آپ عملاً اس کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو وہ نقصان پہنچا سکے جو اس کو وہ پہنچانا چاہتا ہے۔ نفرت کے تحت عمل کرنے والے کا منصوبہ بیشتر حالات میں ناکام رہتا ہے۔

مگر جہاں تک نفرت کرنے والے کا تعلق ہے، اس کے لئے دو میں سے ایک عذاب ہر حال میں مقدر ہے۔ جب تک وہ اپنے انتقامی منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوا ہے انتقام کی آگ میں جلتے رہنا اور اگر بالفرض کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد ضمیر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ اپنے حریف کو قتل کر کے خود بھی اپنے چین کو ہمیشہ کے لئے قتل کر لیتا ہے۔ انتقام کے جنون میں اس کا انسانی احساس دبا رہتا ہے۔ مگر جب حریف پر کامیابی کے نتیجہ میں اس کا انتقامی جوش ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور ساری عمر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے کہ تم نے بہت برا کیا۔

فوجداری کے ایک وکیل نے ایک بار راقم الحروف سے کہا کہ میرا سابقہ زیادہ تر ایسے لوگوں سے پیش آتا ہے جن پر قتل کا الزام ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں جتنے بھی قاتل دیکھے سب کو میں نے پایا کہ قتل کے بعد وہ اپنے قتل پر پشیمان تھے۔ وقتی جوش میں آکر انھوں نے قتل کر دیا مگر جب جوش ٹھنڈا ہوا تو ان کا دل انھیں ملامت کرنے لگا۔ یہی ہر مجرم کا حال ہے۔ کوئی مجرم اپنے کو احساس جرم سے آزاد نہیں کر پاتا۔ جرم کے بعد ہر مجرم کا سینہ ایک نفسیاتی قید خانہ بن جاتا ہے جس میں وہ مسلسل سزا بھگتتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منفی کارروائی سب سے پہلے اپنے خلاف کارروائی ہے۔ منفی کارروائی کا نقصان آدمی کی اپنی ذات کو پہنچ کر رہتا ہے خواہ وہ دوسروں کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

ایک کے بعد دوسرا

پرل ہاربر امریکہ کی ایک بندرگاہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں یہاں امریکی بحریہ کا زبردست فوجی اڈہ قائم تھا۔ ۷ دسمبر ۱۹۴۱ کو جاپان نے اچانک پرل ہاربر پر بمباری کر کے اس کو تباہ کر دیا۔ امریکہ کا جرم یہ تھا کہ وہ جاپان دشمن طاقتوں کے ہاتھ فوجی ہتھیار فروخت کرتا ہے۔ مگر جاپان کے اس جنگی اقدام نے مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اب امریکہ براہ راست جنگ میں شریک ہو گیا۔ اس کے بعد امریکہ، برطانیہ اور روس نے مل کر وہ فوجی محاذ قائم کیا جو تاریخ میں اتحادی طاقتوں (Allied Powers) کے نام سے مشہور ہے۔ اس فوجی اتحاد کا سب سے زیادہ نقصان جاپانیوں کے حصہ میں آیا۔ امریکہ نے اگست ۱۹۴۵ میں جاپان کے دو صنعتی شہروں (ہیروشیما اور ناگاساکی) پر تاریخ کے پہلے ایٹم بم گرائے۔ جاپان کے دونوں صنعتی مراکز بالکل برباد ہو گئے اور اسی کے ساتھ جاپان کی فوجی طاقت بھی۔

پرل ہاربر پر بمباری کرنا بلاشبہ جاپان کی عظیم الشان فوجی غلطی تھی۔ اس اقدام نے غیر ضروری طور پر امریکہ کو جاپان کا دشمن بنا کر براہ راست اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ مگر جاپان ایک زندہ قوم تھی۔ اس نے ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہیں کی۔ اس نے نئے حالات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے لڑنے کے بجائے اس کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کر لیا۔

جاپان کی اس عقل مندی نے اس کے لئے ایک نیا عظیم تر امکان کھول دیا۔ جنگی میدان میں اقدام کے مواقع نہ پا کر اس نے تعلیم اور صنعت کے میدان میں اپنی جد وجہد شروع کر دی۔ سیاسی اور فوجی اعتبار سے اس نے امریکہ کی بالادستی تسلیم کر لی اور دوسرے پرامن میدانوں میں اپنے آپ کو موڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰ سال میں جاپان نے پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور حیثیت حاصل کر لی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مبصر نے لکھا ہے:

That is a queer culmination of Pearl Harbour, but history many contrived corridors and perhaps Pearl Harbour was one of them.

یہ پرل ہاربر کے واقعہ کا بڑا عجیب اختتام ہے۔ مگر تاریخ میں اس طرح سے راستہ نکال لینے کی بہت سی مثالیں ہیں اور شاید پرل ہاربر ان میں سے ایک ہے (ہندستان ٹائمس ۳۰ نومبر ۱۹۸۱)

ہر ناکامی کے بعد ایک نئی کامیابی کا امکان آدمی کے لئے موجود رہتا ہے، بشرطیکہ وہ نہ جھوٹی اکڑ دکھائے اور نہ بے فائدہ ماتم میں اپنا وقت ضائع کرے۔ بلکہ حالات کے مطابق از سر نو اپنی جد وجہد شروع کر دے۔

اپنا احتساب

کھیت میں جب فصل بوئی جاتی ہے تو فصل کے ساتھ طرح طرح کے گھاس پھوس بھی اگتے ہیں۔ گیہوں کے ہر پودے کے ساتھ ایک خودرو گھاس بھی نکلتی ہے اور سرسوں کے ہر درخت کے ساتھ ایک نکما پودا بھی بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ نکلنے والے گھاس پھوس فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ کھیت کے پانی اور کھاد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ اصلی فصل کو بھرپور طور پر بڑھنے نہیں دیتے۔

کسان اگر ان خودرو پودوں کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے تو وہ ساری فصل کو خراب کر دیں۔ کھیت میں دانہ ڈال کر کسان نے جو امیدیں قائم کی ہیں وہ کبھی پوری نہ ہوں۔ اس لئے کسان یہ کرتا ہے کہ وہ کھیت میں نلائی (Weeding) کا عمل کرتا ہے۔ وہ ایک ایک خودرو پودے کو نکالتا ہے تاکہ کھیت کو ان سے صاف کر دے اور فصل کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ کھیت میں دانہ ڈالنا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فصل کے ساتھ اگنے والی دوسری گھاسوں کو چن چن کر نکال دیا جائے، ورنہ کھیت سے مطلوبہ فصل حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ نلائی کا عمل جو کھیت میں کیا جاتا ہے یہی انسانی زندگی میں بھی مطلوب ہے اور اس کا شرعی نام محاسبہ ہے۔ انسان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کو جب کوئی خوبی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ ایک "نکمی گھاس" بھی اس کے اندر سے اگنا شروع ہوتی ہے۔ اس نکمی گھاس کو جاننا اور اس کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کا انجام وہی ہوگا جو بغیر نلائی کئے ہوئے کھیت کا۔

کسی کو اسباب و وسائل ہاتھ آجائیں تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اقتدار مل جائے تو گھمنڈ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ساتھ بخل، علم کے ساتھ فخر، مقبولیت کے ساتھ ریا اور سماجی عزت کے ساتھ نمائش کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں گویا خودرو گھاس ہیں جو کسی آدمی کی خوبیوں کو کھا جانے والی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس اعتبار سے اپنا نگراں بن جائے اور جب بھی اپنے اندر کوئی "نکمی گھاس" اگتے ہوئے دیکھے تو اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو شخص اپنے اوپر محاسبہ کا عمل نہ کرے گا وہ یقینی طور پر اس دنیا میں برباد ہو جائے گا۔ وہ ایسا کھیت ہوگا جس کی فصل تباہ ہو گئی، وہ ایسا باغ ہوگا جس کی ساری بہار خزاں میں تبدیل ہو گئی۔

اور ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالئے۔ سن لو، وہ تو فتنہ میں پڑ چکے۔ اور بے شک جہنم منکروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اگر تمھیں کوئی اچھائی پیش آتی ہے تو ان کو دکھ ہوتا ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور وہ خوش ہو کر لوٹتے ہیں۔ کہو، ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا کارساز ہے اور اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے کہو تم ہمارے لئے صرف دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی کے منتظر ہو۔ مگر ہم تمھارے حق میں اس کے منتظر ہیں کہ اللہ تم پر عذاب بھیجے اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ پس تم انتظار کرو ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہیں ۴۹ – ۵۲

مدینہ میں ایک شخص جُد بن قیس تھا۔ تبوک کے غزوہ میں نکلنے کے لئے اعلان عام ہوا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا کہ مجھے اس غزوہ سے معاف رکھئے۔ یہ رومی علاقہ ہے۔ وہاں رومی عورتوں کو دیکھ کر میں فتنہ میں پڑ جاؤں گا، مگر ایسے مواقع پر عذر پیش کرنا بجائے خود فتنہ میں پڑنا ہے۔ کیونکہ نازک مواقع پر آدمی کے اندر دین کی خاطر فدا ہو جانے کا جذبہ بھڑکنا چاہئے نہ کہ عذرات تلاش کر کے پیچھے رہ جانے کا۔ پھر ایسے کسی عذر کو دینی اور اخلاقی رنگ دینا اور بھی زیادہ برا ہے۔ کیونکہ یہ بے عملی پر فریب کاری کا اضافہ ہے۔

اس قسم کا مزاج حقیقۃً آدمی کے اندر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز تر رکھتا ہے۔ خطرات کے موقع پر ایسے لوگ دین کی راہ میں آگے بڑھنے سے رکے رہتے ہیں۔ پھر جب سچے حق پرستوں کو ان کی غیر مصلحت اندیشانہ دینداری کی وجہ سے کبھی کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو یہ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے اپنے لئے حفاظتی پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ سچے حق پرست خطرات کا مقابلہ کریں اور اس میں انھیں کامیابی ہو تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسا کوئی واقعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہ تھی۔

سچے اہل ایمان کے لئے اس دنیا میں ناکامی کا سوال نہیں۔ ان کی کامیابی یہ ہے کہ خدا ان سے راضی ہو اور یہ ہر حال میں انھیں حاصل ہوتا ہے۔ مومن پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کے دل کی انابت کو بڑھاتی ہے۔ اگر اس کو کوئی سکھ ملتا ہے تو اس کے اندر احسان مندی کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ شکر کر کے خدا کی مزید عنایتوں کا مستحق بنتا ہے۔

"تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں" بظاہر مومنین کا کلمہ ہے۔ مگر حقیقۃً یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا ان لوگوں سے تہدیدی انداز میں کہہ رہا ہے کہ تم لوگ اہل حق کی بربادی کے منتظر ہو، حالانکہ خدا کے تقدیری نظام کے مطابق انھیں ابدی کامیابی ملنے والی ہے۔ اور تمھارے ساتھ جو ہونا ہے وہ یہ کہ تمھارے جرم کو آخری حد تک ثابت کر کے تم کو دائمی طور پر رسوائی اور عذاب کے حوالے کر دیا جائے۔

کہو تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ بے شک تم نافرمان لوگ ہو۔ اور وہ اپنے خرچ کی قبولیت سے صرف اس لئے محروم ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور یہ لوگ نماز کے لئے آتے ہیں تو گرانی کے ساتھ آتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو ناگواری کے ساتھ۔ تم ان کے مال اور اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے انھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔ وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالاں کہ وہ تم میں سے نہیں۔ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے ڈرتے ہیں۔ اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ پائیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو وہ بھاگ کر اس میں جا چھپیں

۵۳—۵۷

مدینہ میں یہ صورت پیش آئی کہ عمومی طور پر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں اکثریت مخلص اہل ایمان کی تھی تاہم ایک تعداد وہ تھی جس نے وقت کی فضا کا ساتھ دیتے ہوئے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس کے اندر وہ سپردگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو حقیقی ایمان اور سچے تعلق باللہ کا تقاضا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منافقین کہا جاتا ہے۔

یہ منافقین زیادہ تر مدینہ کے مال دار لوگ تھے اور یہی مال داری ان کے نفاق کا اصل سبب تھی۔ جس کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہ ہو وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اس اسلام کو اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس میں اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کھونے کے لئے ہو وہ عام طور پر مصلحت اندیشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے بے ضرر احکام کی تعمیل تو وہ کسی نہ کسی طرح کر لیتے ہیں۔ مگر اسلام کے جن تقاضوں کو اختیار کرنے میں جان و مال کی محرومی دکھائی دے رہی ہو، جس میں قربانی کی سطح پر مومن بننے کا سوال ہو ان کی طرف بڑھنے کے لئے وہ اپنے کو آمادہ نہیں کر پاتے۔

مگر قربانی والے اسلام سے پیچھے رہنا ان کے "نماز روزہ" کو بھی بے قیمت کر دیتا ہے۔ مسجد کی عبادت کا بہت گہرا تعلق مسجد کے باہر کی عبادت سے ہے۔ اگر مسجد سے باہر آدمی کی زندگی حقیقی دین سے خالی ہو تو مسجد کے اندر بھی اس کی زندگی حقیقی دین سے خالی ہوگی اور ظاہر ہے کہ بے روح عمل کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ خدا سچے عمل کو قبول کرتا ہے نہ کہ جھوٹے عمل کو۔

کسی آدمی کے پاس دولت کی رونقیں ہوں اور آدمیوں کا جتھا اس کے گرد و پیش دکھائی دیتا ہو تو عام لوگ اس کو رشک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ بدقسمت لوگ ہیں۔ عام طور پر ان کا جو حال ہوتا ہے وہ یہ کہ مال و جاہ ان کے لئے ایسے بندھن بن جاتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی طرف بھرپور طور پر نہ بڑھ سکیں، وہ خدا کو بھول کر ان میں مشغول رہیں یہاں تک کہ موت آجائے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو ان کے مال و جاہ سے جدا کر دے۔

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تم پر صدقات کے بارے میں عیب لگاتے ہیں۔ اگر اس میں سے انھیں دے دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے فضل سے ہم کو اور بھی دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم کو تو اللہ ہی چاہئے۔ صدقات (زکوٰۃ) تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان کارکنوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مقرر ہیں۔ اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر کی امداد میں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۶۰—۵۸

یہاں زکوٰۃ کے مصارف بتائے گئے ہیں۔ یہ مصارف قرآن کی تصریح کے مطابق آٹھ ہیں:

فقراء	جن کے پاس کچھ نہ ہو
مساکین	جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو
عاملین	جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات کی وصولی اور اس کے حساب کتاب پر مامور ہوں
مولفۃ القلوب	جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو یا جو اسلام میں کمزور ہوں
رقاب	غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے یا اسیروں کا فدیہ دے کر انھیں رہا کرنے کے لئے
غارمین	جو مقروض ہو گئے ہوں یا جن کے اوپر ضمانت کا بار ہو
سبیل اللہ	دعوت دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی مد میں
ابن السبیل	مسافر جو حالت سفر میں ضرورت مند ہو جائے خواہ اپنے مکان پر مستغنی ہو

اجتماعی نظم کے تحت جب زکوٰۃ و صدقات کی تقسیم کی جائے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو حق تلفی یا غیر منصفانہ تقسیم کی شکایت ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی شکایت اکثر خود شکایت کرنے والے کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ تقسیم کا ذمہ دار خواہ کتنا ہی پاکباز ہو، لوگوں کی حرص اور ان کا محدود طرز فکر بہر حال اس قسم کی شکایتیں نکال لے گا۔

مزید یہ کہ اس قسم کی شکایت سب سے زیادہ آدمی کے اپنے خلاف پڑتی ہے، وہ آدمی کے فکری امکانات کو بروئے کار لانے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آدمی اگر شکایتی مزاج کو چھوڑ کر ایسا کرے کہ اس کو جو کچھ ملا ہے اس پر وہ راضی ہو جائے اور اپنی سوچ کا رخ اللہ کی طرف کرلے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ اس کے اندر نئی ہمت پیدا ہوگی۔ اس کے اندر چھپی ہوئی ایجابی صلاحیتیں جاگ اٹھیں گی۔ وہ ملی ہوئی رقم کو زیادہ کارآمد مصرف میں لگائے گا۔ عطیات پر انحصار کرنے کے بجائے اس کے اندر اپنے آپ پر اعتماد کرنے کا ذہن ابھرے گا۔ وہ خدا کے بھروسہ پر نئے اقتصادی مواقع کی تلاش کرنے لگے گا۔ دوسروں سے بیزاری کے بجائے دوسروں کو ساتھی بنا کر کام کرنے کا جذبہ اس کے اندر پیدا ہوگا، وغیرہ۔

اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے۔ کہو کہ وہ تمہاری بھلائی کے لئے کان ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور وہ رحمت ہے ان کے لئے جو تم میں اہل ایمان ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اس کو راضی کریں اگر وہ مومن ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے ۶۳—۶۱

مدینہ کے منافقین اپنی نجی مجلسوں میں اسلامی شخصیتوں کا مذاق اڑاتے۔ مگر جب وہ مسلمانوں کے سامنے آتے تو قسم کھا کر یقین دلاتے کہ وہ اسلام کے وفادار ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان مدینہ میں طاقت ور تھے۔ وہ منافقین کو نقصان پہنچانے کی حیثیت میں تھے۔ اس لئے منافقین مسلمانوں سے ڈرتے تھے۔

اس سے منافق کے کردار کا اصل پہلو سامنے آتا ہے۔ منافق کی دینداری انسان کے ڈر سے ہوتی ہے نہ کہ خدا کے ڈر سے۔ وہ ایسے مواقع پر اخلاق و انصاف والا بن جاتا ہے جہاں انسان کا دباؤ ہو یا عوام کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو۔ مگر جہاں اس قسم کا خطرہ نہ ہو اور صرف خدا کا ڈر ہی وہ چیز ہو جو آدمی کی زبان کو بند کرے اور اس کے ہاتھ پاؤں کو روکے تو وہاں وہ بالکل دوسرا انسان ہوتا ہے۔ اب وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کو نہ با اخلاق بننے سے کوئی دلچسپی ہو اور نہ انصاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت۔

جو لوگ مصلحتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور اس بنا پر تحفظات سے اوپر اٹھ کر خدا کے دین کا ساتھ نہیں دے پاتے وہ عام طور پر معاشرہ کے صاحب حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لئے وہ ان لوگوں کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو سچے اسلام کو لے کر اٹھے ہیں۔ وہ ان کے خلاف جھوٹے پروپگنڈے کی مہم چلاتے ہیں۔ ان کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں بے بنیاد قسم کے اعتراضات نکالتے ہیں۔

ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ بے حد سنگین بات ہے۔ یہ اہل ایمان کی مخالفت نہیں بلکہ خود خدا کی مخالفت ہے۔ یہ خدا کا حریف بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اگر اپنی معصومیت ثابت کرنے کے بجائے اپنی غلطی کا اقرار کرتے اور کم از کم دل سے اسلام کے داعیوں کے خیر خواہ ہوتے تو شاید وہ قابل معافی ٹھہرتے۔ مگر ضد اور مخالفت کا طریقہ اختیار کر کے انھوں نے اپنے کو خدا کے دشمنوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ اب رسوائی اور عذاب کے سوا ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

اللہ کا ڈر آدمی کے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں کو بھی خاموشی کے ساتھ سن لیتا ہے، یہاں تک کہ نادان لوگ کہنے لگیں کہ یہ تو سادہ لوح ہیں، باتوں کی گہرائی کو سمجھتے ہی نہیں۔

منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر ایسی سورہ نازل نہ ہو جائے جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کردے۔ کہو کہ تم مذاق اڑالو، اللہ یقیناً اس کو ظاہر کردے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ اور اگر تم ان سے پوچھو تو وہ کہیں گے کہ ہم تو ہنسی اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہو، کیا تم اللہ سے اور اس کی آیات سے اور اس کے رسول سے ہنسی دل لگی کر رہے تھے۔ بہانے مت بناؤ، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کردیں تو دوسرے گروہ کو تو ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہیں ۶۴—۶۶

غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ میں یہ فضا تھی کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے وہ ارباب عزیمت شمار ہو رہے تھے اور جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ رہے تھے وہ منافق اور پست ہمت سمجھے جاتے تھے۔ بیٹھ رہنے والے منافقین نے رسول اور اصحاب رسول کے عمل کو کم تر ظاہر کرنے کے لئے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ کسی نے کہا: یہ قرآن پڑھنے والے ہمیں تو اس کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتے کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ بھوکے ہیں، ہم میں سب سے زیادہ جھوٹے ہیں اور ہم میں سب سے زیادہ بزدل ہیں (ما اری قرائنا ھؤلاء الا ارغبنا بطوناً و اکذبنا السنۃ و اجبننا عند اللقاء) کسی نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ رومیوں سے لڑنا بھی ویسا ہی ہے جیسا عربوں کا آپس میں لڑنا۔ خدا کی قسم کل یہ سب لوگ رسیوں میں بندھے ہوئے نظر آئیں گے (اتحسبون جلاد بنی الاصفر کقتال العرب بعضھم بعضاً واللہ لکانا بکم غداً مقرنین فی الحبال) کسی نے کہا: یہ صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ روم کے محل اور ان کے قلعے فتح کرنے جا رہے ہیں، ان کی حالت پر افسوس ہے (لیظن ھٰذا ان یفتتح قصور الروم وحصونھا، ھیھات ھیھات، تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر پوچھا۔ وہ کہنے لگے: ہم تو صرف ہنسی کھیل کی باتیں کر رہے تھے (انما کنا نخوض ونلعب) اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا اللہ اور اس کے احکام اور اس کے رسول کے معاملہ میں تم ہنسی کھیل کر رہے تھے۔

اللہ اور رسول کی بات ہمیشہ کسی آدمی کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔ یہ آدمی اگر دیکھنے والوں کی نظر میں بظاہر معمولی ہو تو وہ اس کا استہزاء کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ استہزاء اس آدمی کا نہیں ہے خود خدا کا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں، ان کی جھوٹی تاویلیں ان کی حقیقت کو چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

نفاق اور ارتداد دونوں ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں ہیں۔ آدمی اگر اسلام اختیار کرنے کے بعد کھلم کھلا منکر ہو جائے تو یہ ارتداد ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ ذہن اور قلب کے اعتبار سے وہ اسلام سے دور ہو مگر لوگوں کے سامنے وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرے تو یہ نفاق ہے۔ ایسے منافقین کا انجام خدا کے یہاں وہی ہے جو مرتدین کا ہے، الا یہ کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی غلطیوں کا اقرار کر کے اپنی اصلاح کر لیں۔

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ بے شک منافقین بہت نافرمان ہیں۔ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لئے بس ہے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ جس طرح تم سے اگلے لوگ، وہ تم سے زور میں زیادہ تھے اور مال و اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھے ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا، جیسا کہ تمھارے اگلوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اور تم نے بھی وہی بحثیں کیں جیسی بحثیں انھوں نے کی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی لوگ گھاٹے میں پڑنے والے ہیں۔ کیا انھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے ——— قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ ان کے پاس ان کے رسول دلیلوں کے ساتھ آئے۔ تو ایسا نہ تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ۷۰ - ۶۷

پہلے لوگوں کو خدا نے جاہ و مال دیا تو انھوں نے اس سے فخر اور گھمنڈ اور بے حسی کی غذا لی۔ تاہم بعد والوں نے ان کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ انھوں نے بھی دنیا کے ساز و سامان سے اپنے لئے وہی حصہ پسند کیا جس کو ان کے پچھلوں نے پسند کیا تھا۔ یہی ہر دور میں عام آدمی کا حال رہا ہے۔ وہ حق کے تقاضوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مال و اولاد کے تقاضے ہی اس کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہوتے ہیں۔

منافق کا حال بھی باعتبار حقیقت یہی ہوتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر تو مسلمانوں جیسا نظر آتا ہے۔ مگر اس کے جینے کی سطح وہی ہوتی ہے جو عام دنیا داروں کی سطح ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض نمائشی اعمال کو چھوڑ کر حقیقی زندگی میں وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے عام دنیا دار ہوتے ہیں۔ منافق کی قلبی دلچسپیاں دیندار کے مقابلہ میں دنیا داروں سے زیادہ وابستہ ہوتی ہیں۔ آخرت کی مد میں خرچ کرنے سے اس کا دل تنگ ہوتا ہے مگر بے فائدہ دنیوی مشغلوں میں خرچ کرنا ہو تو وہ بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتا ہے۔ حق کا فروغ اس کو پسند نہیں آتا البتہ ناحق کا فروغ ہو تو اس کو وہ شوق سے گوارا کرتا ہے۔ ظاہری دین داری کے باوجود وہ خدا اور آخرت کو اس طرح بھولا رہتا ہے جیسے اس کے نزدیک خدا اور آخرت کی کوئی حقیقت نہیں۔

ایسے لوگ اپنے ظاہری اسلام کی بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ دنیا میں ان کے لئے لعنت ہے اور آخرت میں ان کے لئے عذاب۔ دنیا میں بھی وہ خدا کی رحمتوں سے محروم رہیں گے اور آخرت میں بھی۔

خدا کے ساتھ کامل وابستگی ہی وہ چیز ہے جو آدمی کے عمل میں قیمت پیدا کرتی ہے۔ کامل وابستگی کے بغیر جو عمل کیا جائے، خواہ وہ بظاہر دینی عمل کیوں نہ ہو، وہ آخرت میں اسی طرح بے قیمت قرار پائے گا جیسے روح کے بغیر کوئی جسم، جو جسم سے ظاہری مشابہت کے باوجود عملاً بے قیمت ہوتا ہے۔

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے باغوں کا کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وعدہ ہے ستھرے مکانوں کا ہمیشگی کے باغوں میں، اور اللہ کی رضامندی جو سب سے بڑھ کر ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے ۷۲-۷۱

منافقانہ طور پر اسلام سے وابستہ رہنے والے لوگوں میں جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ ہیں آخرت سے غفلت، دنیوی ضرورتوں سے دلچسپی، بھلائی کے ساتھ تعاون سے دوری اور نمائشی کاموں کی طرف رغبت۔ ان مشترک خصوصیات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے خوب ملے جلے رہتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کو مشترک دلچسپی کا موضوع گفتگو دیتی ہیں۔ اس سے انھیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا میدان حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان کے لئے باہمی تعلقات کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہی معاملہ ایک اور شکل میں سچے اہل ایمان کا ہوتا ہے، ان کے دل میں خدا کی لگن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو سب سے زیادہ آخرت کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی چیزوں سے بطور ضرورت تعلق رکھتے ہیں نہ کہ بطور مقصد۔ خدا کی پسند کا کام ہو رہا ہو تو ان کا دل فوراً اس کی طرف کھنچ اٹھتا ہے۔ برائی کا کام ہو تو اس سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے۔ ان کی زندگی اور ان کا اثاثہ سب سے زیادہ خدا کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اپنے لئے۔ وہ خدا کی یاد کرنے والے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں۔

اہل ایمان کے یہ مشترک اوصاف انھیں ایک دوسرے سے قریب کر دیتے ہیں۔ سب کی دوڑ خدا کی طرف ہوتی ہے۔ سب کی اطاعت کا مرکز خدا کا رسول ہوتا ہے۔ جب وہ ملتے ہیں تو یہی وہ باہمی دلچسپی کی چیزیں ہوتی ہیں جن پر وہ بات کریں۔ انھیں اوصاف کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر ان کے آپس کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ اسی سے انھیں وہ مقصد ہاتھ آتا ہے جس کے لئے وہ متحدہ کوشش کریں۔ اسی سے ان کو وہ نشانہ ملتا ہے جس کی طرف سب مل کر آگے بڑھیں۔

دنیا میں اہل ایمان کی زندگی ان کی آخرت کی زندگی کی تمثیل ہے۔ دنیا میں اہل ایمان اس طرح جیتے ہیں جیسے ایک باغ میں بہت سے شاداب درخت کھڑے ہوں۔ ہر ایک دوسرے کے حسن میں اضافہ کر رہا ہو۔ ان درختوں کو فیضان خداوندی سے نکلنے والے آنسو سیراب کر رہے ہوں۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا اس طرح خیر خواہ اور ساتھی ہو کہ پورا ماحول امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔ یہی ربانی زندگی آخرت میں جنتی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہاں آدمی نہ صرف اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹے گا بلکہ خدا کی خصوصی رحمت سے ایسے انعامات پائے گا جن کا اس سے پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر کڑے بن جاؤ۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا۔ حالاں کہ انھوں نے کفر کی بات کہی اور وہ اسلام کے بعد کافر ہو گئے اور انھوں نے وہ چاہا جو انھیں حاصل نہ ہو سکی۔ اور یہ صرف اس کا بدلہ تھا کہ ان کو اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ اگر وہ توبہ کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر وہ اعراض کریں تو خدا ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں ان کا نہ کوئی حامی ہوگا اور نہ مددگار ۷۴ - ۷۳

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقریباً ۸۰ منافقین مدینہ میں موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منافقین سے جس جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ جنگ کے معنی میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ان منافقین کا خاتمہ کرا دیتے۔ اس سے مراد دراصل وہ جہاد ہے جو زبان اور برتاؤ اور شدت احتساب کے ذریعہ کیا جاتا ہے (امر بالجهاد مع المنافقين باللسان وشدة الزجر والتغليظ، قرطبی عن ابن عباس) چنانچہ جمہور امت کے نزدیک منافقین کے مقابلہ میں جہاد بالسیف مشروع نہیں ہے

منافقت یہ ہے کہ آدمی اسلام کو اس طرح اختیار کرے کہ وہ اس کو مفادات اور مصلحتوں کے تابع کئے ہوئے ہو۔ اس قسم کے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کچھ خدا کے بندے غیر مصلحت پرستانہ انداز میں اسلام کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں تو ایسا اسلام انھیں اپنے اسلام کو بے وقعت ثابت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے داعیوں سے انھیں سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ ان کو اکھاڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس اسلام کے نام پر وہ اپنی تجارتیں قائم کرتے ہیں اسی اسلام کے داعیوں کے وہ دشمن بن جاتے ہیں۔

منافقین کی یہ دشمنی سازش اور استہزار کے انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی کو دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر کسی وجہ سے سچے اسلام کے داعیوں کے بارے میں مخالفانہ جذبات ہیں تو وہ اس کو ابھارتے ہیں تاکہ وہ ان سے لڑ جائے۔ وہ مخلص اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے ان کی قربانیاں بے حقیقت معلوم ہونے لگیں۔ وہ ان کی معمولی باتوں کو اس طرح بگاڑ کر پیش کرتے ہیں کہ عوام میں ان کی تصویر خراب ہو جائے۔ تبوک کے سفر میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک پڑاؤ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہو گئی۔ کچھ مسلمان اس کو تلاش کرنے کے لئے نکلے۔ یہ بات منافقوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: یہ صاحب ہم کو آسمان کی خبریں بتاتے ہیں۔ مگر ان کو اپنی اونٹنی کی خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

منافق مسلمان سچے اسلام کے داعیوں کو ناکام کرنے کے لئے شیطان کے آلۂ کار بنتے ہیں۔ مگر سچے اسلام کے داعیوں کا مددگار ہمیشہ خدا ہوتا ہے۔ وہ منافقوں کی تمام سازشوں کے باوجود ان کو بچا لیتا ہے۔ اور منافقین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا جرم ثابت کر کے اس کے مستحق بنتے ہیں کہ ان کو دنیا میں بھی عذاب دیا جائے اور آخرت میں بھی۔

اور ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے عطا کیا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور ہم صالح بن کر رہیں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کیا تو وہ بخل کرنے لگے اور برگشتہ ہو کر منھ پھیر لیا۔ پس اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا اس دن تک کے لئے جب کہ وہ اس سے ملیں گے اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے۔ وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر صدقات دیتے ہیں اور جو صرف اپنی محنت مزدوری سے انفاق کرتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ تم ان کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ انھیں معاف کرنے کی درخواست کرو گے تو اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کا انکار کیا اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھاتا ۸۰ ـ ۷۵

ثعلبہ بن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لئے دعا کیجئے کہ خدا مجھے مال دیدے۔ آپ نے فرمایا: تھوڑے مال پر شکر گزار ہونا اس سے بہتر ہے کہ تم کو زیادہ مال ملے اور تم شکر ادا نہ کر سکو۔ مگر ثعلبہ نے بار بار درخواست کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ خدایا ثعلبہ کو مال دے دے۔ اس کے بعد ثعلبہ نے بکری پالی۔ اس کی نسل اتنی بڑھی کہ مدینہ کی زمین ان کی بکریوں کے لئے تنگ ہو گئی۔ ثعلبہ نے مدینہ کے باہر ایک وادی میں رہنا شروع کیا۔ اب ثعلبہ کے اسلام میں کمزوری آنا شروع ہوئی۔ پہلے ان کی جماعت کی نماز چھوٹی۔ پھر جمعہ چھوٹ گیا۔ حتیٰ کہ یہ نوبت آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عامل ثعلبہ کے پاس زکوٰۃ لینے کے لئے گیا تو ثعلبہ نے زکوٰۃ نہیں دی اور کہا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے (ما ھٰذہ الا اخت الجزیۃ، ما ھٰذہ الا اخت الجزیۃ)

وہ شخص خدا کی نظر میں منافق ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ مال کے لئے خدا سے دعائیں کرے اور جب خدا اس کو مال والا بنا دے تو وہ اپنے مال میں خدا کا حق نکالنا بھول جائے۔ آدمی کے پاس مال نہیں ہوتا تو وہ مال والوں کو برا کہتا ہے کہ یہ لوگ مال کو غلط کاموں میں برباد کرتے ہیں۔ اگر خدا مجھ کو مال دے تو میں اس کو خیر کے کاموں میں خرچ کروں۔ مگر جب اس کے پاس مال آتا ہے تو اس کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ پہلے اس نے کیا کہا تھا اور کن جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ مال کو اپنی محنت اور لیاقت کا نتیجہ سمجھ کر تنہا اس کا مالک بن جاتا ہے۔ خدا کا حق ادا کرنا اسے یاد نہیں رہتا۔

اس قسم کے لوگ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے مزید سرکشی یہ کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ کسی نے زیادہ دیا تو اس کو ریاکار کہہ کر گراتے ہیں۔ اور کسی نے اپنی حیثیت کی بنا پر کم دیا تو کہتے ہیں کہ خدا کو اس آدمی کے صدقہ کی کیا ضرورت تھی۔ جو لوگ اتنا زیادہ اپنے آپ میں گم ہوں انھیں اپنے آپ سے باہر کی اعلیٰ تر حقیقتیں کبھی دکھائی نہیں دیتیں۔

پیچھے رہ جانے والے اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت خوش ہوئے اور ان کو گراں گزرا کہ وہ اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اور انھوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انھیں سمجھ ہوتی۔ پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ، اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔ پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لائے اور وہ تم سے جہاد کے لئے نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ کبھی نہیں چلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے۔ تم نے پہلی بار بھی بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا پس پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس پر تم کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے ۸۴ — ۸۱

غزوۂ تبوک سخت گرمی کے موسم میں ہوا۔ مدینہ سے چل کر شام کی سرحد تک تین سو میل جانا تھا۔ منافق مسلمانوں نے کہا کہ ایسی تیز گرمی میں اتنا لمبا سفر نہ کرو۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھول گئے کہ خدا کی پکار سننے کے بعد کسی خطرہ کی بنا پر نہ نکلنا اپنے آپ کو شدید تر خطرہ میں مبتلا کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دھوپ سے بھاگ کر آگ کے شعلوں کی پناہ لی جائے۔

جو لوگ خدا کے مقابلہ میں اپنے کو اور اپنے مال کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں وہ جب اپنی خوبصورت تدبیروں سے اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ مسلمان بھی بنے رہیں اور اسی کے ساتھ ان کی زندگی اور ان کے مال کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کو بیوقوف کہتے ہیں جنھوں نے خدا کی رضا کی خاطر اپنے کو ہلکان کر رکھا ہو۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ یہ ایسا ہنسنا ہے جس کا انجام رونے پر ختم ہونے والا ہے۔ کیونکہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں اس قسم کی "ہوشیاری" سب سے بڑی نادانی ثابت ہوگی۔ اس وقت آدمی افسوس کرے گا کہ وہ جنت کا طلب گار تھا مگر اس نے اپنے اثاثہ کی وہی چیز اس کے لئے نہ دی جو دراصل جنت کی واحد قیمت تھی۔

اس قسم کے منافق ہمیشہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی تحفظاتی پالیسی کی وجہ سے اپنے گرد مال و جاہ کے اسباب جمع کر لیتے ہیں اس بنا پر عام مسلمان ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاندار زندگیاں اور ان کی خوبصورت باتیں لوگوں کی نظر میں ان کو عظیم بنا دیتی ہیں۔ یہ کسی اسلامی معاشرہ کے لئے ایک سخت امتحان ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ میں ایسے لوگوں کو نظر انداز کیا جانا چاہئے، نہ یہ کہ ان کو عزت کا مقام دیا جانے لگے۔

جن لوگوں کے بارے میں پوری طرح معلوم ہو جائے کہ وہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں مگر حقیقۃً وہ اپنے مفادات اور اپنی دنیوی مصلحتوں کے وفادار ہیں ان کو حقیقی اسلامی معاشرہ کبھی عزت کے مقام پر بٹھانے کے لئے راضی نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہے کہ وہ اسلامی تقریبات میں صرف پیچھے کی صفوں میں جگہ پائیں۔ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ دینی مناصب کے لئے وہ نااہل قرار پائیں۔ جس معاشرہ میں ایسے لوگوں کو عزت کا مقام ملا ہوا ہو وہ کبھی خدا کا پسندیدہ معاشرہ نہیں ہو سکتا۔

اور ان کے مال اور ان کی اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ منکر ہوں۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان کے مقدور والے تم سے رخصت مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دیجئے کہ ہم یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں۔ انھوں نے اس کو پسند کیا کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی پس وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اور انھیں کے لئے ہیں خوبیاں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ان کے لئے اللہ نے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے ۸۵ ـ ۸۹

منافق اپنے دنیا پرستانہ طریقوں کی وجہ سے اپنے آس پاس دنیا کا ساز و سامان جمع کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ مددگاروں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ یہ چیزیں سطحی قسم کے لوگوں کے لئے مرعوب کن بن جاتی ہیں۔ لیکن گہری نظر سے دیکھنے والوں کے لئے اس کی ظاہری چمک دمک قابل رشک نہیں بلکہ قابل عبرت ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں جن لوگوں کے پاس جمع ہوں وہ ان کے لئے خدا کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو کسی تحفظ اور کسی مصلحت کے بغیر خدا کی طرف بڑھے۔ مگر جو لوگ دنیا کی رونقوں میں گھرے ہوئے ہوں وہ ان سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ جب بھی وہ خدا کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں ان کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ کھو دیں گے۔ وہ اس قربانی کی ہمت نہیں کر پاتے، اس لئے وہ خدا کے وفادار بھی نہیں ہوتے۔ ان کی دنیوی ترقیاں ان کو اس بربادی کی قیمت پر ملتی ہیں کہ آخرت میں وہ بالکل محروم ہو کر حاضر ہوں۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب خدا کا دین کہتا ہے کہ اپنی انا کو دفن کر کے خدا کو پکڑو تو وہ اپنی بڑھی ہوئی انا کو دفن نہیں کر پاتے۔ جب خدا کا دین ان سے شہرت اور مقبولیت سے خالی راستوں پر چلنے کے لئے کہتا ہے تو وہ اپنی شہرت و مقبولیت کو سنبھالنے کی فکر میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جب خدا کے دین کی جدوجہد زندگی اور مال کی قربانی مانگتی ہے تو ان کو اپنی زندگی اور مال اتنے قیمتی نظر آتے ہیں کہ وہ اس کو غیر دنیوی مقصد کے لئے قربان نہ کر سکیں۔

یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کے دل کی حساسیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بے حسی کا شکار ہو کر اس تڑپ کو کھو دیتے ہیں جو آدمی کو خدا کی طرف کھینچے اور غیر خدا پر راضی نہ ہونے دے۔

اس کے برعکس جو سچے اہل ایمان ہیں وہ سب سے بڑا مقام خدا کو دئے ہوتے ہیں اس لئے دوسری ہر چیز انھیں خدا کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتی ہے۔ وہ ہر قربانی دے کر خدا کی طرف بڑھنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے خدا کی رحمتیں اور نعمتیں ہیں۔ ان کے اور خدا کی ابدی جنت کے درمیان موت کے سوا کوئی چیز حائل نہیں۔

بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ کرنے والے آئے کہ انھیں اجازت مل جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولے وہ بیٹھ رہے۔ ان میں سے جنھوں نے انکار کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ کوئی گناہ کمزوروں پر نہیں ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ نیک کاروں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب تمھارے پاس آئے کہ تم ان کو سواری دو۔ تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کر دوں تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس غم میں کہ انھیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں۔ الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو تم سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی، پس وہ نہیں جانتے ۹۳ — ۹۰

دعوت دین کی جدوجہد جب لوگوں سے ان کی زندگی اور ان کے مال کا تقاضا کر رہی ہو اس وقت صاحب استطاعت ہونے کے باوجود عذر کر کے بیٹھ رہنا بدترین جرم ہے۔ یہ دینی پکار کے معاملہ میں بے حسی کا ثبوت ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس قسم کا رویہ خدا اور رسول سے غداری کرنے کے ہم معنی ہے۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں میں کوئی حصہ پانے کے حقدار نہیں ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ تھا اس کو جب انھوں نے خدا کے لئے پیش نہیں کیا تو خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ کس لئے انھیں دیدے گا۔ قیمت ادا کئے بغیر کوئی چیز کسی کو نہیں مل سکتی۔

تاہم معذورین کے لئے خدا کے یہاں معافی ہے۔ جو شخص بیمار ہو، جس کے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ نہ ہو، جو اسباب سفر نہ رکھتا ہو، ایسے لوگوں سے خدا درگزر فرمائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نہ کرنے کے باوجود سب کچھ ان کے خانہ میں لکھ دیا جائے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم کوئی راستہ نہیں چلے اور تم نے کوئی وادی طے نہیں کی مگر وہ برابر تمھارے ساتھ رہے (ان بالمدینۃ اقواماً ما قطعتم وادیاً ولا سرتم سیرا الا وھم معکم)

یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جو نہ کرنے کے باوجود کرنے کا انعام پاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو معذور ہونے کے ساتھ تین باتوں کا ثبوت دیں ——— نصح، یعنی عملی شرکت نہ کرتے ہوئے بھی قلبی شرکت۔ احسان، یعنی عدم شرکت کے باوجود کم از کم زبان سے ان کے بس میں جو کچھ ہے اس کو پوری طرح کرتے رہنا۔ حزن، یعنی اپنی کوتاہی پر اتنا شدید رنج جو آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑے۔

کوئی آدمی جب اپنی عملی زندگی میں ایک چیز کو غیر اہم درجہ میں رکھے اور بار بار ایسا کرتا رہے تو اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اس چیز کی اہمیت کا احساس اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس چیز کے تقاضے اس کے سامنے آتے ہیں مگر دل کے اندر اس کے بارے میں تڑپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی طرف بڑھ نہیں پاتا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو بے حسی کہا جاتا ہے اور اسی کو قرآن میں دلوں پر مہر کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ ایمان ہے

خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ انسان کو زندگی مل جائے	انعام	۱۲۲
ایمانی شعور آدمی کے جینے کی سطح بلند کر دیتا ہے	انفال	۲
ایمان ساری کائنات کو آدمی کی غذا بنا دیتا ہے	آل عمران	۱۹۱
ایمان کے ساتھ آدمی بینا ہے اور ایمان کے بغیر اندھا	غافر	۵۸
ایمان آدمی کے دل کو اللہ کے خوف سے پگھلا دیتا ہے	حدید	۱۶
ایمان سے آدمی کے اندر حق اور ناحق کی گہری پہچان پیدا ہوتی ہے	انفال	۲۹
ایمان والی روح کو صرف اللہ کی یاد سے تسکین حاصل ہوتی ہے	رعد	۲۸
ایمان آدمی کو خدا کی دنیا میں پوری طرح جما دیتا ہے	ابراہیم	۲۷
ایمانی شعور کے بعد آدمی کے اوپر شیطان کا بس نہیں چلتا	نحل	۹۹
ایمان سے عالی ظرفی اور فکری بلندی پیدا ہوتی ہے	نور	۱۲
ایمان والی زبان سے وہی بات نکلتی ہے جو درست ہو	احزاب	۷۰
ایمان کے بعد آدمی کی ساری محبت صرف اللہ کے لئے ہو جاتی ہے	بقرہ	۱۶۵
ایمان وہ ہے جو آدمی کو حق کی حمایت کے لئے مجبور کر دے	اعراف	۱۵۷
ایمان آدمی کو سچوں کے گروہ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے	توبہ	۱۱۹
ایمان آدمی کو اللہ کی خاطر متواضع بنا دیتا ہے	ہود	۲۳
ایمان اس سے بلند کر دیتا ہے کہ آدمی لوگوں کو دکھانے کے لئے عمل کرے	نساء	۳۸
ایمان والا آدمی اللہ کے فیصلہ پر راضی ہو جاتا ہے	نساء	۶۵
ایمان آدمی کے دل میں دوسرے بھائیوں کے لئے نرم گوشہ پیدا کر دیتا ہے	توبہ	۷۱
ایمان آدمی کو خدا کے ساتھ عہد میں باندھ دیتا ہے	احزاب	۲۳
ایمان زندگی کے ہر معاملہ میں جنتی راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے	یونس	۹
ایمان آدمی کو اس سے اوپر اٹھا دیتا ہے کہ وہ کسی چیز کو عزت کا سوال بنائے	مجادلہ	۱۱
ایمان والا دل بغض و حسد سے بالکل خالی ہوتا ہے	حشر	۱۰
ایمان آدمی کے اندر قول و عمل کے فرق کو ختم کر دیتا ہے	صف	۲
ایمان کے بعد خدا کی کشش ہر دوسری کشش پر غالب آجاتی ہے	منافقون	۹
ایمان آدمی کو خدا کے بارے میں بے حد حساس بنا دیتا ہے	توبہ	۱۳

دھوکے بازی

برطانیہ کا ایک آرٹسٹ ہے جس کا نام اسٹیفن پریسیٹ لی (Stephen Priestley) ہے۔ چلیسٹر (انگلینڈ) میں ایک نیلام میں اس کی چار تصویریں رکھی گئیں۔ اس کی تصویروں کی قیمت صرف ایک پونڈ لگی۔ چنانچہ اسٹیفن پریسیٹ لی (پیدائش ۱۹۵۴) کو ایک پونڈ کا چک دے دیا گیا۔

برطانوی آرٹسٹ ایک پونڈ کا چک پاکر بہت خفا ہوا۔ اس کے نزدیک اس کی ان چار تصویروں کی قیمت اس سے بہت زیادہ تھی جتنی قیمت خریدار کی طرف سے اس کو ملی۔ اس نے اپنے چک پر ایک پونڈ کی رقم کو ۱۰۰۱ پونڈ بنا دیا۔ وقتی طور پر اس نے بنک سے ۱۰۰۱ پونڈ کی رقم حاصل کرلی۔ مگر بہت جلد بنک والوں کو معلوم ہوگیا کہ اس نے بنک کے سامنے جو چک پیش کیا اس کی رقم جعلی تھی۔ اسٹیفن پریسیٹ لی کو پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ جیل میں دھوکے بازی کے جرم میں سزا بھگت رہا ہے (ہندستان ٹائمس ۲ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس واقعہ کا تعلق دنیا کے معاملہ سے ہے۔ مگر اسی میں آخرت کے معاملہ کی تصویر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس صرف ایک پونڈ کا "عمل" ہے مگر وہ اس کو ایک ہزار ایک پونڈ دکھا کر کیش کرانا چاہتے ہیں ——— کوئی دین کا ایک جزئی کام کر رہا ہے اور اسی کو وہ کلی کام بتاتا ہے، کوئی ذاتی شہرت کے لئے سرگرم ہے اور اس کو خدمت دین کا عنوان دئے ہوئے ہے۔ کوئی قومی عصبیت کے تحت متحرک ہے اور اس کو اسلامی تحریک قرار دینا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کر رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ کوئی دولت و عزت کی خاطر کسی کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کو اسلامی اخوت کے پُر فخر لفظ سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بحثوں اور مناظروں میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ احیاء اسلام کا مجاہد ہے۔ کوئی معمولی اصلاح کا کام کر رہا ہے اور اس کو دعوت و تبلیغ کا شاندار نام دئے ہوئے ہے۔

ان میں سے ہر شخص موجودہ دنیا میں بھرپور طور پر اپنی قیمت وصول کر رہا ہے۔ وہ اپنے معمولی عمل کو بہت بڑا عمل ثابت کرکے خوش ہے۔ مگر موت ان ساری خوش فہمیوں کو باطل کر دے گی۔ موت کے بعد آنے والی عدالت میں ایسے تمام لوگ دھوکے بازی کے مجرم قرار پائیں گے، خواہ آج کی دنیا میں وہ اپنے ایک پونڈ کے چک سے ایک ہزار ایک پونڈ کی رقم کیش کرانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

اخلاقی شعور

روسی ناول نگار دوستووسکی (۱۸۸۱ــ ۱۸۲۱) کا ایک ناول ہے جس کا نام ہے جرم وسزا۔ اس کا ہیرو ایک بدخو، بدمزاج، کریہہ المنظر، لاولد اور بوڑھی عورت کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی روز افزوں مگر بے کار دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ جب یہ واقعہ ہوتا ہے تو نہ صرف ناول کے قاری بلکہ ناول کے سارے کردار اسے مجرم قرار دیتے ہیں۔

بڑھیا کی دولت اس شخص کے لئے اتنی ہی مفید تھی جتنا کسی شیر کے لئے ہرن کا گوشت۔ شیر ایک ہرن کو مار کر اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس کے لئے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر اسی قسم کا فعل ایک انسان کرتا ہے تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کو اس کے فعل کی پوری سزا دی جائے۔ صحیح اور غلط کی یہ تقسیم صرف انسان کی نفسیات میں پائی جاتی ہے۔ دوسری تمام موجودات قانون فطرت یا جبلت کے تحت عمل کرتی ہیں، وہ اس قسم کے کسی فرق سے خالی ہیں۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے۔ وہ ہر فعل کو صحیح اور غلط کی ترازو پر تولتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اخلاقی حدود کے اندر زندگی گزارے۔ جب کہ جانور اس قسم کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ جانوروں کے یہاں صرف مفید اور مضر کی تقسیم ہے نہ کہ صحیح اور غلط کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لئے ایک ایسے ضابطہ کی ضرورت ہے جس میں اس کے اخلاقی شعور کے مطابق صحیح اور غلط کو متعین کیا گیا ہو۔ جانوروں کو جو ضابطہ درکار ہے وہ ابتدا سے ان کی جبلت میں موجود ہوتا ہے۔ انسان اپنے ساتھ اپنا ضابطہ نہیں رکھتا۔ یہ خلا بتاتا ہے کہ انسان کے لئے ضرورت ہے کہ باہر سے اس کو ایک ضابطۂ اخلاق فراہم کیا جائے۔ "قانون" یہی ضابطۂ اخلاق فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ مگر اس کا یہ حال ہے کہ پانچ ہزار برس کی بہترین کوششوں کے باوجود انسانی دماغ ابھی تک اپنے لئے قانون کی کوئی متفقہ بنیاد دریافت نہ کر سکا۔

کچھ لوگ اس ناکامی کو یہ حیثیت دیتے ہیں کہ ابھی انسان اپنی تلاش کے مرحلہ میں ہے۔ وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ ٹاکویلی (Tocqueville) کے یہ الفاظ اسی قسم کے لوگوں کی ترجمانی کر رہے ہیں:

A new science of politics is indispencible to a new world

(نئی دنیا کے لئے ایک نیا علم سیاست ضروری ہے) مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ناکامی تلاش کی ناکامی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جہاں وہ اپنی کوششوں سے پہنچ ہی نہیں سکتا۔

انسان کے اندر اخلاقی شعور ہونا مگر انسان کا خود سے اخلاقی قانون وضع نہ کر سکنا، نظام فطرت کا ایک خلا ہے۔ یہ خلا وحی کی ضرورت ثابت کرتا ہے۔ اگر ایک بار اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد اسلام تک پہنچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آپریشن

فونکس (امریکہ) کے اسپتال میں ایک شخص نے داخلہ لیا۔ اس کے پیٹ میں نہایت سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کا کیس قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اس کے پیٹ میں ایک ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ یہی ہیرا اس کے ناقابل برداشت درد کا سبب تھا۔ ہیرا اس کے پیٹ سے نکال کر الگ کیا گیا۔ اس ہیرے کے ساتھ اب بھی قیمت کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ اس پرچہ پر لکھا ہوا تھا ——— ۶۵۰۰ ڈالر۔

فوراً پولیس طلب کی گئی۔ پوچھ گچھ کے دوران مریض نے بتایا کہ اس کو انعام میں یہ ہیرا ملا تھا اور غلطی سے وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ تاہم بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ شخص ایک بار ہیرے کی ایک دکان میں داخل ہوا اور وہاں ایک ہیرا چرا لیا۔ مگر جب وہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو دکان دار کو شبہ ہوا۔ اس نے آدمی کا پیچھا کیا۔ جب آدمی نے دیکھا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے تو اس نے ہیرے کو جلدی سے منہ میں ڈالا اور نگل لیا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی مگر وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد فوراً اس کو گرفتار کر لیا گیا (ہندستان ٹائمس ۵ نومبر ۱۹۸۱ء)

ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہ ہو سکا۔ وہ مجبور ہو گیا کہ چھپائے ہوئے ہیرے کو نکال کر باہر لائے اور خود اپنے جرم کا زندہ ثبوت بن جائے۔ یہی معاملہ شدید تر صورت میں لوگوں کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں آدمی ایک شخص کا حق دباتا ہے، وہ کسی کو وہ کلمۂ اعتراف دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو از روئے واقعہ اسے دینا چاہئے۔ یہ سب کر کے بھی آدمی موجودہ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ زور اور ہوشیاری کے ذریعہ وہ اپنے جرم کو چھپا لیتا ہے۔ مگر یہ صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔ موت ہر آدمی کے لئے گویا قدرت کا آپریشن ہے جو اس کے اندر کو باہر کر دیتا ہے اور اس کے چھپے کو کھلا بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظلم اور بے انصافی کو بھی خدا کی یہ کائنات کبھی قبول نہیں کرتی۔

آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی آپریشن اس کی حقیقت کو کھول دے اور اس کے لئے اپنے جرائم کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

ثواب

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے وہ عام طور پر ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ملازموں اور ماتحت کارکنوں کو تو صرف واجبی تنخواہ یا اجرت دیتے ہیں۔ دوسری طرف کانفرنس یا ریلیف فنڈ یا مشہور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ ملازم یا کارکن کو جو رقم دی جاتی ہے وہ تو ان کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔ اس پر ہم کو ثواب نہیں ملے گا۔ انھوں نے ہماری خدمت کی اور ہم نے ان کو معاوضہ دے دیا۔ اس پر ثواب کیسا۔ یہ تو دونوں طرف سے معاملہ برابر ہوگیا۔ اس کے برعکس اداروں اور ملی کاموں میں جو رقم دی جاتی ہے ان کے متعلق یقینی ہے کہ ان پر ثواب ملے گا۔

مگر اس کی تہ میں اصل بات کچھ اور ہے اور یہ جواب محض اصل بات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش موجود ہے کہ وہ جو کچھ دے اس کا معاوضہ اس کو اسی دنیا میں ملے۔ غریب آدمی یہ معاوضہ پیسہ کی صورت میں چاہتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے ان کو جس معاوضہ کی تمنا ہوتی ہے وہ سماجی حیثیت (سوشل اسٹیٹس) ہے۔ یہی وہ چھپی ہوئی خواہش ہے جو اس قسم کے لوگوں کے انفاق کا رخ بڑی بڑی قابل ذکر مدوں کی طرف کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غریب ملازم یا کارکن یہ معاوضہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس نہ اخبار ہوتا ہے نہ اسٹیج۔ اس کے پاس نہ اونچی بلڈنگوں والے ادارے ہیں اور نہ استقبال کرنے والا حلقہ۔ مگر ایک شخص جب کسی مشہور ادارہ یا کسی "عظیم الشان" ملی مہم میں رقم دیتا ہے تو اس کو امید رہتی ہے کہ اس کو شان دار معاوضہ ملے گا ——— جلسوں کی صدارت، عوامی مواقع پر نمایاں نشست، اداروں میں پرزور استقبال، سماجی حیثیت میں اضافہ، اخباروں میں نام چھپنا اور بڑے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ ملنا، وغیرہ

ثواب کا تعلق نیت سے ہے نہ کہ قابل تذکرہ مدوں سے۔ ثواب حقیقۃً اس عمل میں ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ ثواب یہ ہے کہ اللہ کی خاطر ایسی مدوں میں دیا جائے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان مواقع پر خرچ کیا جائے جہاں ہر قسم کے دوسرے محرکات حذف ہو جاتے ہیں۔ جس انفاق کا فائدہ اسی دنیا میں وصول کر لیا گیا ہو اس کا فائدہ کسی کو آخرت میں ملے گا تو کیوں ملے گا۔

لوگ دکھائی دینے والے مقامات پر انفاق کر رہے ہیں حالاں کہ خدا ان کے انفاق کو قبول کرنے کے لئے اس مقام پر کھڑا ہوا ہے جو ظاہر پرست انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

جھوٹا استدلال

جنگ جمل میں حضرت زبیر بن العوام بھی شامل تھے۔ وہ حضرت علی کے خلاف تھے اور ان کے مخالف گروہ کے ساتھ شامل ہوکر حضرت علی سے لڑنے کے لئے آئے تھے۔ میدان جنگ میں ان کی گفتگو حضرت علی سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ گئے اور لڑائی میں شریک نہ ہوئے۔ ان کے لڑکے عبداللہ نے پوچھا کہ آپ نے کیوں ایسا کیا۔ انھوں نے جواب دیا: میں نے علی کے لشکر میں عمار بن یاسر کو دیکھا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا"۔ جنگ جمل میں حضرت عمار بچ گئے البتہ اس کے بعد جنگ صفین میں مارے گئے۔ اس واقعہ کے بعد واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ حضرت علی کے مخالفین غلطی پر تھے۔ اس کھلی ہوئی دلیل کے باوجود مخالفین نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: عمار کو اس نے قتل کیا ہے جو ان کو میدان جنگ میں لایا تھا (انما قتلہ من جاء بہ الی الحرب) یہ توجیہہ تیزی سے تمام مخالفین میں پھیل گئی اور سب نے اس کو درست سمجھ کر قبول کرلیا۔

آدمی اگر نہ ماننا چاہے تو وہ کھلے ہوئے دلائل کے انکار کے لئے بھی کچھ نہ کچھ الفاظ پالے گا۔ تاہم ایک سچی دلیل ہوتی ہے اور ایک جھوٹی دلیل۔ دنیا میں انسان کو آزادی ملی ہوئی ہے اس لئے یہاں وہ جھوٹی دلیل چلا سکتا ہے۔ مگر جب آخرت آئے گی تو وہاں تمام جھوٹے دلائل بالکل بے معنی ہوجائیں گے۔ وہاں اسی دلیل میں وزن ہوگا جو خدا کے نزدیک دلیل ہو، جس کا دلیل ہونا خدا کے محکم قوانین سے ثابت ہوتا ہو۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہاں کا ایک برتن دودھ کو جس طرح قبول کرتا ہے اسی طرح وہ شراب کو بھی قبول کرلیتا ہے۔ ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ اپنے برتن کو چاہے دودھ سے بھرے چاہے شراب سے۔ یہی حال انسانی الفاظ کا ہے۔ انسانی الفاظ میں بڑی لچک ہے۔ ایک باطل بات بھی الفاظ میں اسی طرح ڈھل جاتی ہے جس طرح ایک حق بات۔

یہ صورت حال آدمی کو دھوکا دیتی ہے۔ وہ اپنی جھوٹی خواہشوں اور بے بنیاد خیالات کو الفاظ کی صورت دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنا برسرحق ہونا ثابت کردیا۔ حالاں کہ یہ دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہت جلد یہ حالات ختم ہوجائیں گے۔ خدا امتحان کی دنیا کو توڑ کر انجام کی دنیا بنائے گا۔ اس وقت وہ آزادی چھن جائے گی جو آج امتحانی مصلحت کی بنا پر ہر ایک کو ملی ہوئی ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو اس نے دلیل سمجھ رکھا تھا وہ محض ایک دھاندلی تھی، وہ لفظی بازیگری تھی نہ کہ حقیقت بیانی۔ اس وقت وہ جان لے گا کہ اس نے بے معنی الفاظ کو بامعنی الفاظ سمجھ لیا تھا، اگرچہ اس وقت کا جاننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

سب سے بڑا اندیشہ

وہ کون سا ڈر ہے جس کا اندیشہ سب کو ہو۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ موت ہے، صرف موت ہی اس دنیا میں ایک ایسی چیز ہے جس کے اندیشے سے کوئی بھی شخص خالی نہیں۔

ایک غریب مزدور جو روز کماتا ہو اور روز کھاتا ہو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی دن مزدوری نہ ملی تو بھوکا رہنا ہوگا۔ مگر امیر آدمی کو اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک کمزور آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ پڑ جائے تو مضبوط آدمی اس کو دبا لے گا، مگر جو طاقت ور ہو اس کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک شخص قانون نہ جانتا ہو تو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کی جائداد پر کوئی شخص غلط طریقہ سے قبضہ نہ کر لے۔ مگر جو قاعدے قانون سے واقف ہو اس کو اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک شخص جس کی ملازمت ابھی عارضی ہو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کا افسر خفا ہو جائے اور اس کو برخاست نہ کر دے، مگر جو مستقل ہو چکا ہو اس کو اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک شخص کی آمدنی کم ہو تو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر خرچ کی کوئی مد زیادہ نکل آئی تو کیسے کام چلے گا۔ مگر جس کی آمدنی زیادہ ہو اسے اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک چھوٹے دوکان دار کو اندیشہ ہوتا ہے کہ بازار کا بھاؤ خراب ہو گیا تو اس کا نقصان ہو جائے گا مگر بڑے بڑے تاجر جو بازار بھاؤ پر حکومت کرتے ہیں ان کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک غریب شخص مقدمہ میں پھنس جائے تو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں مقدمہ ہار نہ جائے۔ مگر جو سرکار رس ہو اور جو بڑے بڑے وکیلوں کی فیس ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ کسی ملک میں جو شخص اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی حق تلفی نہ کی جائے مگر اکثریتی فرقہ کے ایک فرد کے لئے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔

غرض کوئی ایسا خطرہ اور اندیشہ نہیں ہے جو سب کے لئے یکساں ہو۔ ہر اندیشہ ایک کو ہوتا ہے تو دوسرے کو نہیں ہوتا۔ صرف موت اس دنیا میں ایک ایسی چیز ہے جس کے اندیشے سے کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ موت کے آگے سارے لوگ بے بس ہیں۔ موت ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جو ہر ایک کو بہر حال تسلیم کرنی ہوتی ہے۔ موت ان لوگوں کو بھی آتی ہے جن کو نہ علاج کی سکت ہے اور نہ کوئی ان کی تیمار داری کرنے والا ہے، اور ان لوگوں کو بھی آتی ہے جن کی دیکھ بھال اور علاج کے لئے ڈاکٹروں اور نرسوں کی فوج لگی ہوتی ہے، اور جن کے لئے ہر وقت ہوائی جہاز کھڑے رہتے ہیں کہ کوئی بات ہو تو فوراً انھیں اڑا کر بہترین اسپتال اور بہترین صحت بخش مقام پر پہنچا دیں۔ موت کمزور کو بھی آتی ہے اور مضبوط کو بھی، مریض کو بھی اور تندرست کو بھی، بچہ کو بھی اور بوڑھے کو بھی، عورت کو بھی اور مرد کو بھی، رعایا کو بھی اور بادشاہ کو بھی، جاہل کو بھی اور سائنس داں کو بھی۔ کسی بھی شخص کو کوئی ایسی تدبیر نہیں

معلوم جس کے ذریعہ وہ موت سے بچ سکے۔ یا ایک دن کے لئے بھی موت کو ٹال سکے۔ وہ ہر حال میں، ہر جگہ اور ہر شخص کو آلیتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔

ہر اندیشہ سے آدمی بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کے پاس ذریعہ آمدنی نہ ہو یا کم ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کا کام نہیں چلے گا تو وہ اپنی آمدنی کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی کمزور ہو تو وہ کوشش کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا ساتھ حاصل کرلے جو ضرورت کے وقت اس کی مدد کر سکتے ہوں۔ غرض ہر اندیشہ سے بچنے کا طریقہ ہے اور اس طریقہ کو اختیار کر کے آدمی بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر کیا موت کے اندیشے سے بچنے کا بھی کوئی طریقہ ہے۔

لوگوں نے طرح طرح سے موت کے اندیشہ سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ امریکہ کے ایک شخص سینفرڈ بینٹ (Sanford Bannet) کو خیال ہوا کہ بڑھاپا موت کا اصل سبب ہے۔ اس لئے بڑھاپے کو روکو۔ اس نے اس موضوع پر زبردست مطالعہ کیا۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ بڑھاپے کا اصل سبب یہ ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ہماری شریانوں اور وریدوں میں ایک فاسد مادہ جمع ہونے لگتا ہے جس کو کولسٹرول (Cholestrol) کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری خون کی نالیوں کی قدرتی لچک ختم ہو کر ان میں سختی آجاتی ہے۔ اسی صورت حال کا دوسرا نام بڑھاپا ہے۔ چنانچہ یہ امریکی محقق اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر جسم کے عضلات پر تناؤ اور ڈھیل کا عمل کر کے شریانوں اور وریدوں میں جمع شدہ مادے کو نکال دیا جائے تو دوبارہ شباب کی واپسی ممکن ہے۔

اب اس نے اس مقصد کے لئے ورزش شروع کی۔ بلکہ ورزشیں ایجاد کیں اور ۲۵ سال تک وہ اپنے قبل از وقت بڑھاپے کو دوبارہ جوانی کی طرف لوٹانے کے لئے مسلسل کوشش کرتا رہا۔ اس کوشش کے شاندار نتائج کو اس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے جس کا نام ہے "بڑھاپا اور اس کا سدباب"۔ اس کتاب میں مصنف کی دو تصویریں ہیں۔ ایک پچاس سال کی اور دوسری پچھتر سال کی۔ پچاس سالہ عمر کی تصویر ایک ایسے شخص کا منظر پیش کرتی ہے جس کے چہرے پر افسردگی طاری ہے اور ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔ وہ دیکھنے میں ایک بوڑھا شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پچھتر سال کی عمر کی جو تصویر ہے اس میں اس شخص کی صورت اس طرح بدل گئی ہے کہ بالکل دوسرا تر و تازہ جوان بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ شخص جس نے چوتھائی صدی کی طویل جد و جہد کے بعد اپنے کو بڑھاپے سے نکال کر دوبارہ جوان بنا لیا تھا، عین اس "جوانی" کے عالم میں ایک روز اس طرح مر گیا کہ وہ سوچ بھی نہ سکا کہ اب اس سے بچنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔

اسی طرح بہت سے ایسے بڑے بڑے لوگ جن کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی، انھوں نے موت کے اندیشے سے بچنے کی تمام ممکن کوششیں کی ہیں۔ کسی نے سمجھا کہ اونچے محل میں رہ کر وہ موت سے بچ سکتا ہے،

چنانچہ اس نے پہاڑ کی چوٹی پر شاندار محل کھڑا کر دیا اور اس میں زندگی گزارنے لگا۔ کسی نے سمجھا کہ دوا علاج میں موت سے بچنے کا راز ہے تو اس نے بہترین ڈاکٹروں اور طبیبوں کی فوج اپنے ساتھ لگا دی۔ کسی کا خیال ہوا کہ وہ موت کا انکار کر کے موت کو ٹال سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ارادہ اور شعور کی پوری قوت کے ساتھ موت کا انکار کر دیا۔ کسی کا خیال ہوا کہ بہترین غذا میں ابدی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے چنانچہ اس نے دنیا بھر کی قیمتی غذائیں اپنے دسترخوان پر جمع کر دیں۔ کسی نے سمجھا کہ بیماروں سے دور رہ کر وہ موت سے بچ سکتا ہے تو اس نے سارے بیماروں کو اپنے سے اتنا دور کر دیا کہ قیاساً ان کی سانس سے نکلی ہوئی ہوا کا کوئی جزر اس کو چھونے نہ پائے۔ کسی نے سمجھا کہ سگریٹ اور شراب کو چھوڑ کر وہ موت سے بچ سکتا ہے تو اس نے سگریٹ اور شراب ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔ کسی کی سمجھ میں آیا کہ وہ شادی نہ کر کے ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے تو اس نے تمام عمر شادی نہ کی اور عورتوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا۔

مگر کسی کی تدبیر نے کوئی کام نہ کیا اور موت اپنے وقت پر آکر رہی۔ اب تک کی تاریخ کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ موت پر انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ موت انسانی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جس کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے۔ موت نہ اپنا وقت بتاتی نہ ہم سے کچھ دریافت کرتی، وہ بالکل آچانک آتی ہے۔ اور جب آتی ہے تو کسی کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ اس کے چنگل سے اپنے کو نکال سکے۔ کوئی بھی علم، کوئی بھی طاقت، کوئی بھی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو موت کے مقابلہ میں ذرہ برابر انسان کی کوئی مدد کر سکے۔ اس معاملہ میں فیصلہ کا سارا اختیار ایک فریق کو ہے دوسرے فریق کو کوئی اختیار نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی آمد کو روکنے کی ساری باتیں احمقانہ ہیں۔ اصل بات سوچنے کی یہ نہیں ہے کہ موت کو کیسے روکیں۔ بلکہ اصل بات سوچنے کی یہ ہے کہ موت کے بعد پیش آنے والے خطرہ سے کیسے اپنے آپ کو بچائیں۔ جب زلزلہ پیما آلہ خبر دے کہ زلزلہ آرہا ہے تو کوئی یہ سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرتا کہ زلزلہ کو کیسے روکا جائے۔ بلکہ ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ زلزلہ کے ممکن نتائج سے کس طرح اپنے کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ زلزلہ جب آرہا ہے تو وہ بہرحال آکر رہے گا ہم اس کی آمد کو روک نہیں سکتے، ہمارے بس میں جو چیز ہے وہ صرف یہ کہ اپنے کو اس کے خطرات سے بچانے کی فکر کریں، اسی طرح ہزاروں برس کے تجربات نے بتایا ہے کہ موت بہرحال آتی ہے اور ہر شخص کے لئے آتی ہے۔ اب ہم جو چیز کر سکتے ہیں وہ صرف یہ کہ موت کا اس طرح استقبال کریں کہ وہ ہمارے لئے کسی نئی مصیبت میں پڑنے کا سبب نہ بن جائے۔

یہاں "موت کے بعد کیا ہے" کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ موت کے اس پار دیکھنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ مگر موت ہی ایک ایسا واقعہ نہیں ہے جس کے اس پار داخل ہونے سے پہلے آدمی نہ دیکھ سکتا ہو،

دوسری اسی نوعیت کی بہت سی صورتیں ہیں جو ہماری زندگی میں پیش آتی ہیں اور ہم ان میں ایک احتیاطی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہی ہم کو موت کے معاملہ میں بھی کرنا چاہئے۔

کسی اجنبی سڑک پر آپ تیزی سے چلے جا رہے ہوں اور یکایک ایک موڑ پر بڑے بڑے سرخ حرفوں میں لکھا ہوا نظر آئے ——— خبردار (Caution) ایسے موقع پر آپ کیا کریں گے۔ یقیناً ایک شخص کے دل میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ موڑ کے اس پار تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے میں کیسے مانوں کہ اس کی کوئی حقیقت ہے۔ کیوں نہ میں سمجھوں کہ کسی نے یوں ہی تماشے کے لئے یہ لفظ لکھ دیا ہے۔ مگر عقلمند آدمی ہمیشہ ایسے مقام پر سوچے گا:

"اگر یہ انتباہ صحیح ہوا تو.....۔"

اس دوسرے امکان کا اندیشہ اس کو مجبور کرے گا کہ وہ ٹھہر کر حقیقتِ حال دریافت کرے، اور پھر اگر اس کی واقعیت پر مطمئن ہو جائے تو اپنے سفر کو اس کے مطابق بنائے۔ موت بھی ایک قسم کا انتباہ ——— سب سے بڑا انتباہ ہے۔ وہ ہم کو ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ قرائن اگر کسی احتیاطی روش کا تقاضا کرتے ہوں تو ہم پہلی فرصت میں اس کو اختیار کر لیں۔ جس طرح سڑک پر چلنے والا آدمی "انتباہ" کا بورڈ دیکھ کر صرف قرائن کی بنیاد پر اس کے صحیح ہونے کو مان لیتا ہے۔ اور اصل خطرے کو دیکھے بغیر اس کی ہدایات کے مطابق اپنی گاڑی چلانے لگتا ہے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی یہ کوئی عقلی روش نہیں ہوگی کہ ہم موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے موت کے اُس پار دیکھنے پر اصرار کریں۔ ہم صرف قرائن کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہی ہمیں کرنا چاہئے۔

قرائن کا فیصلہ کیا ہے۔ قرائن کا فیصلہ یہ ہے کہ انسان موت کے بعد بھی باقی رہے۔ مادہ اگر مٹ کر توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جسمانی انسان فنا ہونے کے بعد کسی نئی زیادہ پائدار شکل میں باقی نہ رہے۔ مزید یہ کہ موت صرف انسانی جسم پر وارد ہوتی ہے۔ بظاہر اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ انسانی شعور بھی انسانی جسم کے مرنے کے ساتھ مر جاتا ہو۔

دوسری بات یہ کہ انسان، تمام دوسری چیزوں کے برعکس ایک اخلاقی وجود ہے۔ وہ خیر و شر کا احساس رکھتا ہے۔ انسان کی یہ خصوصیت تقاضا کرتی ہے کہ اخلاقی تقاضوں کے مطابق اس کا فیصلہ ہو۔ اس کے عمل خیر کا بدلہ اس کو خیر کی صورت میں ملے اور اس کے عمل شر کا بدلہ اس کو شر کی صورت میں دیا جائے ——— ان دونوں قرائن کا لحاظ کیا جائے تو موت کے بعد زندگی اور اسی کے ساتھ جنت و جہنم دونوں ثابت ہو جاتے ہیں (رمضان ۱۳۸۶ھ)

تخریبی سیاست کا انجام

عباسی خلیفہ مستنصر باللہ ۶۴۱ھ میں فوت ہوا۔ یہ بہت نازک زمانہ تھا۔ چنگیز خاں کی قیادت میں تاتاریوں نے ماوراء النہر سے لے کر بحر روم اور بحر اسود تک کے تمام ملکوں کو تاراج کر ڈالا تھا۔ تاہم عراق پر اب بھی عباسی خلیفہ کا قبضہ تھا اور تاتاریوں کے اوپر خلیفہ بغداد کا رعب اتنا زیادہ تھا کہ وہ عراق کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تاتاریوں کے مفتوحہ ممالک میں بدستور خلیفہ بغداد کا خطبہ مسجدوں میں پڑھا جاتا تھا۔

مستنصر باللہ کا ایک بھائی خفاجی نامی تھا جو بہت بہادر اور اولوالعزم تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھ کو خلیفہ بنایا جائے تو میں دریائے جیحوں کے پار تک ان تاتاریوں کا نام و نشان مٹا دوں۔ مگر سلطنت کے درباری اتنے طاقت ور خلیفہ کو اپنے لئے مسئلہ سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر خفاجی کو تخت پر بٹھایا گیا تو وہ ہماری بات چلنے نہ دے گا۔ چنانچہ ۶۴۱ھ میں مستنصر باللہ کا انتقال ہوا تو ارکان سلطنت نے خفاجی کو تخت پر بیٹھنے نہ دیا۔ انھوں نے مستنصر باللہ کے لڑکے ابو احمد عبداللہ کو خلافت کے لئے پسند کیا۔ کیونکہ وہ بہت نرم اور سادہ لوح قسم کا آدمی تھا۔ اس کو نہایت آسانی سے اپنے موافق بنایا جا سکتا تھا۔ مستنصر باللہ کے بعد اس کا یہی بیٹا تخت پر بیٹھا اور اس کو مستعصم باللہ کے نام سے پکارا گیا۔

اسی خلیفہ کے زمانہ میں تاتاریوں کی تباہی اپنی تکمیل تک پہنچی۔ وہ ذاتی طور پر اگرچہ دیندار اور متبع سنت تھا مگر وہ انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے پہلی بنیادی غلطی یہ کی کہ مویدالدین علقمی کو اپنا وزیر بنا دیا۔ علقمی ایک غالی شیعہ آدمی تھا۔ اس کے سینہ میں یہ آگ بھڑک رہی تھی کہ علویوں کے حق خلافت کو غصب کرنے والے عباسیوں کا خاتمہ کر دے۔ اور ان کی جگہ پر دوبارہ علوی خلافت قائم کرے۔ عباسیوں سے اس کا نفرت اور بغض اس کو اس انتہا تک لے گیا کہ وہ درپردہ تاتاریوں کا دوست بن گیا۔ عباسی سلطنت کو ختم کرنے کا کام وہ خود اپنی طاقت سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ تاتاریوں کا سہارا لے کر پہلے اپنے "دشمن" کو ختم کرے اور اس کے بعد اپنی منشا کے مطابق علوی خاندان کے کسی فرد کو بغداد کے تخت پر بٹھائے۔

علقمی نے وزارت پانے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ شیعوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ حکومت کے تمام شعبوں میں شیعوں کو کلیدی مقامات پر بٹھا دیا۔ یہاں تک کہ حکومت پوری طرح علقمی کے ہاتھ میں آگئی۔ اب اس نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ کوشش شروع کر دی کہ عباسیوں کا نام و نشان مٹا دے اور بغداد میں علویوں کی حکومت قائم

کر دے۔ خلیفہ محل کی مصنوعی دنیا میں رہتا تھا۔ نیز علقمی خلیفہ کے سامنے حد درجہ نیاز مند اور وفادار بن کر آتا تھا۔ اس لئے خلیفہ اس کی اندرونی سازشوں سے واقف نہ ہو سکا۔ تاہم شہر کے بعض لوگ اس کے منصوبوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے خلیفہ سے مل کر اس کو مطلع کیا۔ مگر خلیفہ علقمی کی ظاہری وفاداریوں کی وجہ سے اس کے بارے میں اتنا خوش فہم تھا کہ اس نے ان لوگوں کی باتوں کو خود علقمی سے بیان کر دیا۔ اب علقمی نے اور بھی زیادہ اپنی وفاداری اور فرماں برداری ظاہر کر کے خلیفہ کو یقین دلا دیا کہ جن لوگوں نے خلیفہ سے اس قسم کی باتیں کہی ہیں وہ فتنہ پرور اور غدار ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی دار و گیر شروع ہو گئی اور ان کے انجام کو دیکھ کر بقیہ لوگوں نے بھی اپنی زبانیں بند کر لیں۔

اب علقمی نے چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں سے خفیہ خط و کتابت شروع کی جس کی سلطنت خراسان تک پہنچ چکی تھی، علقمی کے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ ہلاکو خاں کے ساتھ "متحدہ محاذ" بنا کر عباسی خلافت کا خاتمہ کر دے اور اس کے بعد علوی خلافت کے قیام کے بارے میں اپنے منصوبہ کی تکمیل کرے۔ تاہم تاتاری حکمراں پر عباسی خلیفہ کا اتنا دبدبہ تھا کہ وہ بغداد پر فوج کشی کرنے کے لئے راضی نہ ہوا۔ علقمی نے اصرار کیا تو اس نے کہا کہ جب تک میرے پاس کافی ضمانت نہ ہوگی میں بغداد پر اقدام نہیں کر سکتا۔ علقمی کے تخریبی ذہن نے ضمانت کی ایک تدبیر سوچ لی۔ اس نے خلیفہ کو یقین دلایا کہ ہمارے پاس فوج ضرورت سے زیادہ ہے۔ ملکی محاصل کا بڑا حصہ اس کے اوپر خرچ ہو جاتا ہے۔ اس لئے خرچ کو کم کرنے کی صورت یہ ہے کہ فوج کی تعداد گھٹا دی جائے۔ خلیفہ کی رضامندی لے کر علقمی نے فوج کے ایک بڑے حصہ کی چھٹی کر دی۔ کچھ فوجیوں کو بغداد سے دور دوسرے مقامات پر بھیج دیا اور خلیفہ سے یہ کہہ دیا کہ ان کو تاتاریوں کی روک تھام کے لئے سرحد پر بھیجا گیا ہے۔

علقمی کا ایک ساتھی خود ہلاکو خاں کے دربار میں موجود تھا۔ یہ نصیر الدین طوسی تھا۔ طوسی بھی علقمی کی طرح غالی شیعہ تھا اور علقمی کے منصوبہ میں پوری طرح شریک تھا۔ طوسی کی معرفت علقمی نے ہلاکو خاں کو پیغام بھیجا کہ بغداد کو میں نے فوجوں سے خالی کر دیا ہے۔ حربی سامان کا بھی بڑا حصہ باہر بھیج دیا ہے۔ یہ واقعہ ہلاکو خاں کی ضمانت طلبی کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ اُدھر طوسی نے ہلاکو خاں کو یقین دلایا کہ علم نجوم سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کے اوپر آپ کا قبضہ بہت جلد ہونے والا ہے۔ ان یقین دہانیوں کے بعد ہلاکو خاں نے بغداد کا رخ کیا۔ پچاس روز تک بغداد کا محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران دونوں طرف کی فوجوں میں کئی بار لڑائیاں ہوئیں۔ مگر علقمی شہر کی تمام خبریں خفیہ طور پر ہلاکو خاں کو پہنچا دیتا تھا۔ اور اس طرح بغداد والوں کی ہر اس دفاعی کوشش کو ناکام بنا دیتا تھا جو وہ تاتاریوں کے خلاف کرنا چاہتے تھے

جب محاصرہ بڑھا تو علقمی نے ایک فرضی کارروائی کرکے خلیفہ سے کہا کہ ہلاکو خاں آپ کو امان دینے پر راضی ہوگیا ہے بشرطیکہ آپ اس سے ملیں اور آئندہ کے لئے کوئی باعزت سمجھوتہ کرلیں۔ خلیفہ علقمی کے کہنے میں آگیا اور علقمی کے ساتھ اپنے محل سے نکل کر ہلاکو خاں کے یہاں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی ہلاکو خاں نے اس کو گرفتار کرکے بند کردیا اور بغداد کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ بغداد کی مکمل تباہی کے بعد ۹ صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں خلیفہ معتصم کو لے کر بغداد میں داخل ہوا۔ خلیفہ سے پوچھ پوچھ کر محل کے تمام خفیہ خزانے نکلوائے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ خلیفہ کو قتل کردیا جائے۔ علقمی نے ہلاکو خاں سے کہا مسلمانوں کے خلیفہ کے خون سے اپنی تلوار کو آلودہ نہ کرو۔ بلکہ اس کو کچلوا کر مارو۔ چنانچہ طوسی اور علقمی نے خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر اس کو ایک ستون میں باندھ دیا۔ اس کے بعد اس پر اتنی لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا۔

عباسی خلیفہ کو ختم کرنے کے بعد علقمی نے حسب قرارداد ہلاکو سے کہا کہ بغداد میں کسی علوی کو حاکم مقرر کردے اور اس کو خلیفہ کا خطاب دے دے۔ ہلاکو خاں نے ابتداءً اس قسم کے مبہم وعدے کرلئے تھے جس کی وجہ سے علقمی کو یقین تھا کہ ہلاکو خاں کسی علوی کو خلیفہ بنا کر مجھ کو اس کا نائب سلطنت بنا دے گا۔ مگر ہلاکو خاں نے علقمی کو ڈانٹ دیا۔ اور بغداد پر اپنی قوم کا ایک حاکم مقرر کیا۔ علقمی اس ذلت اور ناکامی کو برداشت نہ کرسکا اور اس کے بہت جلد بعد گھٹ گھٹ کر مرگیا۔

یہ وہی سیاست ہے جس کا خوبصورت نام موجودہ زمانہ میں متحدہ محاذ رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی تخریبی سیاست ہر زمانہ میں رائج رہی ہے ——— کچھ سیاسی حوصلہ مندوں نے بنو امیہ کے ساتھ مل کر ہاشمی خلافت کو ختم کیا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے سیاست داں اٹھے اور انھوں نے بنو عباس کے محاذ میں شامل ہوکر بنو امیہ کو ختم کیا۔ پھر ایک اور سیاسی گروہ اٹھا اور اس نے تاتاریوں کا ساتھ دے کر بنو عباس کا خاتمہ کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے مفروضہ سیاسی حریف کو مشترکہ قوت سے ہٹا دے اور اس کے بعد اپنے آپ کو اوپر لائے۔ مگر ہر ایک کا ایک ہی انجام ہوا۔ وہ وقت کے قابض گروہ کو ہٹانے میں تو ضرور کامیاب ہوگیا مگر اپنے آپ کو اوپر لانے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

تاریخ کا یہ تجربہ کافی تھا کہ موجودہ زمانہ میں اس کو نہ دہرایا جائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے موجودہ زمانہ کے قائدین آج بھی مسلسل اس کو دہرا رہے ہیں۔ نہ تاریخ کی مثالیں ان کو سبق دینے کے لئے کافی ثابت ہوئیں اور نہ خود اپنا ناکام تجربہ۔ سیاسی تقلید کی یہ انوکھی مثال اس امت کے رہنما دہرا رہے ہیں جس کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ پر ایمان لانے والا آدمی کبھی ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا (المومن لا یلدغ من جحر مرتین)

معبود کی طلب

روس کے خلائی مسافر اندرن نکولائیف اگست ۱۹۶۲ میں جب ایک خلائی پرواز سے واپس ہوئے تو ۲۱ اگست کو ماسکو کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا :

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں

انسان جیسی ایک مخلوق کے لئے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لئے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت برآری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربہ کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے ہی جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذبات محبت کو اس کے لئے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لئے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لئے نثار کر دے۔

روسی خلاباز پر جو کیفیت زمین کو پاکر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پاکر گزرنا چاہئے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کا حسن دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لئے۔

جنت صبر کے اُس پار ہے

صالح سماج بنانے کا سارا دار و مدار اس چھوٹی سی بات پر ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ اس طرح رہے کہ دونوں اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

جس چیز کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے وہ کسی قسم کے سیاسی اکھیڑ پچھاڑ سے وجود میں نہیں آتا۔ اور نہ گولی اور پھانسی کی منطق سے اس کو برپا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی کارروائیوں سے اسلامی نظام قائم کرنے کا اعلان کرتے ہیں وہ یقینی طور پر یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا مجنون ہیں۔

اسلامی نظام یا اسلامی سماج اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی انسانی مجموعہ کی قابل لحاظ تعداد میں یہ مزاج پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر زندگی گزارنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر جینا جانتے ہوں۔ جو اپنے خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کر دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ جو اپنی غلطی کو فوراً محسوس کر لیں اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ جو دوسروں کو الزام دینے کے بجائے خود ذمہ داری قبول کر لیں۔ جو غلط فہمی کے مواقع پر خوش فہمی سے کام لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو کسی انسان کو اس کے "آج" کے بجائے اس کے "کل" کے لحاظ سے دیکھ سکیں۔

یہ سب کچھ ٹھنڈے طریقہ سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے آدمی کو برداشت کی تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ الفاظ رکھتے ہوئے آدمی نہ بولے۔ وہ ہر وار کو اپنے اوپر سہے۔ وہ اپنے سینہ کو دبے ہوئے جذبات کا قبرستان بنا دے۔ مختصر یہ کہ اپنے تمام حقوق کو وہ آخرت کے خانہ میں ڈال دے اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو دنیا کے خانہ میں۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جہنم کو لذتوں سے ڈھانک دیا گیا ہے اور جنت کو ناخوش گواریوں سے ڈھانک دیا گیا ہے (حجبت النار بالشهوات وحجبت الجنة بالمكاره) جو آدمی اپنے جی کی راہ پر بے روک ٹوک چلے وہ سیدھا جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص جنت میں اپنی جگہ لینا چاہے اس کو اپنی خواہشات پر روک لگانا ہوگا۔ اپنے جی میں اٹھنے والے محرکات کو دبانا ہوگا۔ ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا، خواہ ان کا پورا کرنا اس کے لئے کتنا ہی تلخ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت صبر کے اُس پار ہے، اگرچہ لوگ اپنی نادانی سے اس کو بے صبری کے اُس پار سمجھ لیتے ہیں۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

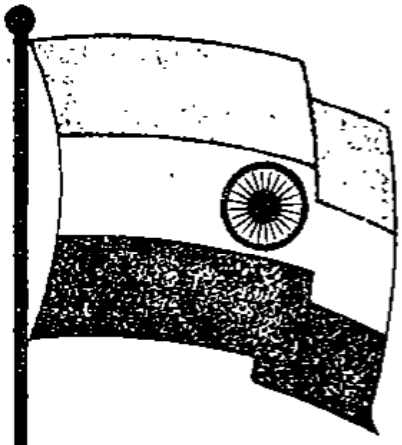

آیئے ایک مُنصفانہ معاشرتی نظام کے لئے
مل جُل کر کام کریں۔ یہ صرف مشترکہ نصب العین،
باہمی تعاون اور سخت محنت سے ہی
حاصل ہو سکتا ہے۔
ایک
مُلک
ایک قوم
davp 81/278

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ ۱۴ جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

ہمدرد

HD-5949 AU

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 63
FEBRUARY 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱- الاسلام	۱۵-۰
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰
۳- ظہورِ اسلام	۱۵-۰
۴- دین کیا ہے؟	۲-۰
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۵-
۶- تجدیدِ دین	۳-۰
۷- اسلام دینِ فطرت	۳-۰
۸- تعمیرِ ملت	۳-۰
۹- تاریخ کا سبق	۳-۰
۱۰- مذہب اور سائنس	۵-۰
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۳-۰
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۲-۰
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰
۱۴- تعارفِ اسلام	۲-۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰
۱۶- راہیں بند نہیں	۳-۰
۱۷- دینی تعلیم	۳-۰
۱۸- ایمانی طاقت	۳-۰
۱۹- اتحادِ ملت	۳-۰
۲۰- سبق آموز واقعات	زیرِ طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۳-۰
۲۴- زلزلۂ قیامت	۴-۰